کالی شلوار

سعادت حسن منٹو

کالی شلوار

کالی شلوار

سعادت حسن منٹو

مکتبۂ شعروادب سمن آباد لاہور

ناشر ———— نواز چوہدری

مطبع ———— ندرت پرنٹرز لاہور

قیمت ———— پندرہ روپے

فہرست مضامین

کبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سرد دیہات کے تکیئے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھدے ہوئے گڑھے میں بڑے بڑے اُپلوں سے آگ سلگا رہی ہے۔ صبح کے سرد اور مٹیلے دُھندلکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھوں کو سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دُہرا کر کے مُنہ قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے اُپلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اُڑتی ہے اور اُس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھِسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آ گئی ہے۔

اُپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھرّیوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سُلگا چکی ہے۔ یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اُس کے پردادانے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے ایک زمانے سے اُن کے قبضہ میں تھی۔ گاما سائیں کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی ایک تکئے کی مجاور تھی۔ گاما سائیں سارے گاؤں میں ہر دلعزیز تھا۔ ذات کا وہ کمہار تھا مگر چونکہ اُسے تکیے

کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ اس لیے اُس نے برتن بنانے چھوڑ دیے تھے، لیکن اُس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں۔ بھنگ گھوٹنے کیلئے وہ سال بھر میں چھ کونڈیاں بنایا کرتا تھا جن کے متعلق بڑے فخر سے وہ یہ کہا کرتا تھا "چوہدری لوہا ہے لوہا ـــــ فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی دادا لے تو اُس کا پوتا بھی اسی میں بھنگ گھوٹ کر پیئے"۔

مرنے سے پہلے گاما سائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا جو اب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکیے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے۔ گھوٹنے کے لیے گاما سائیں نہیں تھا پر اُس کے بہت سے چیلے چانٹے جو اب سر بھویں منڈا کر سائیں بن گئے تھے، اُس کے بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیواں کی سُلگائی ہوئی آگ سُلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام کو تو خیر کافی رونق رہتی تھی مگر دوپہر کو آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ اِدھر اُدھر کونے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی کابک تھے جن میں گاما سائیں کے ایک بہت پرانے دوست ابو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے۔ تکیے کی دھوئیں بھری فضا میں اِن سفید اور چتکبرے کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جس طرح تکیے میں آنے والے لوگ شکل و صورت سے معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیواں کے بڑے لڑکے نے جھانجھ پہنا رکھے تھے بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبدالغفار تھا۔ اُس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کے موقعہ دیکھنے کے لیے گاؤں

میں آیا کرتا تھا اور گاما سائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی۔ جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اس کے نام میں تھا بیداری کی بُو سُونگھ سکتی تھی مگر جب اُس نے بارھویں سال میں قدم رکھا تو اُس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ خاصا تگڑا جوان تھا پر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برسوں میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا۔ یعنی ناک سے رینٹھ بہنے لگا اور چُپ چُپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی سے چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور مُنہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا۔ پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کی ناک سے رینٹھ اور مُنہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اُس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی ہیں۔ اور اُس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اُسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو کما ہی لیگا۔ کمانا وماناکیا تھا۔ عبدالغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا، وہ بھی اس لئے کہ اُس کی ماں نے اُس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ کبوتروں والا سائیں اُسے اس لئے کہا جاتا تھا کہ اُسے کبوتروں سے بہت پیار تھا۔ تکیئے میں جتنے کبوتر تھے اُن کی دیکھ بھال اب تو پہلوان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ باہر اس کی ماں آگ سُلگا رہی تھی —!

چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں اِس لئے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے مگر تکیہ جو کہ گاؤں سے فاصلہ پر تھا ابھی تک

آباد نہ ہوا تھا، البتہ دُور کونے میں مائی جیواں کی بکری زور زور سے ممیا رہی تھی۔

مائی جیواں آگ سُلگا کر بکری کیلئے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اُسے اپنے پیچھے آہٹ سُنائی دی۔ مُڑ کر دیکھا تو اُسے ایک اجنبی سر پر ٹھاٹا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا۔ پگڑی کے ایک پلّو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا تھا۔ جب اُس نے موٹی آواز میں "مائی جیواں، سلام علیکم" کہا تو پگڑی کا کھُردرا کپڑا اُس کے مُنہ پر تین چار مرتبہ سُکڑا اور پھیلا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کئے بغیر کہا، "وعلیکم السلام — آؤ بھائی بیٹھو۔ آگ تاپو۔"

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھکر اُس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سُلگتی رہتی تھی۔ اجنبی اور وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیواں سے کہا، "ماں، اللہ بخشے گاما سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا۔ اُس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے بہت صدمہ ہوا۔ مجھے آسیب ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چمٹا تھا کہ اللہ کی پناہ، گاما سائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دُور ہو گئی۔"

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سُنتی رہی جو کہ اُس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا، "میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں، ایک خاص بات کہنے کے لئے۔" اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اُس کی بات کوئی اور تو نہیں سُن رہا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا، "میں سُندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہوں۔ پرسوں رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ مارنے والے ہیں۔ خون خرابہ ضرور ہو گا، اس لئے میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو دُور ہی رکھنا۔

میں نے سُنا ہے کہ گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا، ایسا نہ ہو کہ جوش مار اُٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں ــــ تم اُن کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو تو ٹھیک رہے گا ــــ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے ــــ السلام علیکم۔"

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اُٹھا اور جس راستے سے آیا تھا اُسی راستے سے باہر چلا گیا۔

سُندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا۔ اُس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اُسی کا نام لیکر ڈرایا کرتی تھیں۔ بے شمار گیت اُسکی بہادری اور بیباکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے۔ اس کا نام سُنکر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔ سُندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اُس سے اپنی اچانک ملاقات کے من گھڑت قصّے سُنانے میں ایک خاص لذّت محسوس کرتا تھا۔ اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے۔ بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قد آور جوان ہے، بڑی بڑی مونچھوں والا۔ ان مونچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں ان کی مدد سے اُٹھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہوگا۔ بہرحال سب متفقہ طور پر اُسکی طاقت اور بیباکی کے مُعترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سُنا کہ سُندر جاٹ اُنکے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کیلئے آرہا ہے تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اُس کا شکریہ ہی ادا کر سکی۔ مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سُندر جاٹ کا ڈاکہ کیا معنی رکھتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب اُس نے ساتھ والے گاؤں

حملہ کیا تھا تو سُکھی لالہ مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی تھی اور گاؤں کی سب سے سُندر اور چنچل چھوکری بھی ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اُس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ یہ بلا اب اُن کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں میں کسی اور کو نہ تھا۔ مائی جیواں نے سوچا کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے —— چوہدری کے گھر خبر کر دے —— لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے۔ پچھلے دنوں اس نے تھوڑا سا ساگ اُن سے مانگا تھا تو اُنھوں نے انکار کر دیا تھا۔ گھیٹا رام حلوائی کو متنبہ کر دے.... نہیں، وہ بھی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی۔ گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور اُن میں سے کسی ایک کو بھی اُس نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا۔ اِس کے علاوہ اس نے سوچا اگر اُس نے کسی کو ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا اور یوں سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اُٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی اور رحمن کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اُسے عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا۔ اس کی یہ ہنسی آج خلافِ معمول معنی خیز تھی۔ مائی جیواں کو اُس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوشمندی کی نشانی ہے۔

جب وہ کوٹھڑی کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا۔ "ماں! یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟"

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا، اس لئے اُسکی ماں جواب دیئے بغیر اندر چلی گئی اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی۔ "اے رحمان، اے رحمان اُٹھ، اُٹھ۔"

بار بار جھنجوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور وہ جب آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش میں آگیا تو اُس کی ماں نے اس کو ساری بات سُنادی۔ رحمان کے تو اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بہت ڈرپوک تھا۔ گو اُس کی عمر اس وقت بائیس ۲۲ برس کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اُس میں ہمت اور شجاعت نام تک کو نہ تھی۔ سندر جاٹ! ــــ اتنا بڑا ڈاکو، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا تو پورے بیس ۲۰ گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا، پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لئے آرہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا بلکہ یوں کہیئے کہ وہ اُسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمان کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بیباک شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ گاؤں کے سب جوان لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ بڑے بڑے ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اُڑا دیتی تھی۔ چوہدری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دُور دُور سے اُس کو نیچا دکھانے کے لئے آتے تھے مگر اُسکی کلائی کسی سے بھی نہ مُڑی تھی۔ وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا مگر اُس کی یہ ساری اکڑفوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی جب اُس نے دھان کے کھیت میں اُس سے کہا۔ "فجے، اگنڈا سنگھ کی کلائی مروڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلہ میں کوئی آدمی ہی نہیں رہا ــــ آ، میرے سامنے بیٹھ، میری کلائی پکڑ: ان دو

انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ چھڑا دوں تو نیتی نام نہیں ہے۔"

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اسکی طاقت اور شہزوری کے رعب اور دبدبے میں آکر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی لیکن جب اس نے کئی آدمیوں کے سامنے اس کو مقابلے کی دعوت دی تو وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر پر چڑھ جاتی ہے اور اگر وہ اس کی دعوت قبول کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے عورت ذات سے مقابلہ کرتے شرم تو نہیں آئی مردود کو۔ اسکی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے نیتی کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا۔ نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں، ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہو گئی ——— اس دن سے لیکر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔

ہاں، تو اس نیتی سے رحمان کو محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ ڈرپوک تھا اسی طرح اس کا پریم بھی ڈرپوک تھا۔ دور سے دیکھ کر وہ اپنے دل کی ہوس پوری کرتا تھا اور جب کبھی وہ اس کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ حرف مدعا زبان پر لائے۔ مگر نیتی سب کچھ جانتی تھی۔ وہ کیا کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ بیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ اس کے عشق میں کون گرفتار نہیں تھا ——— سب اس سے محبت کرتے تھے۔ اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ محبت کرنے کی خواہش البتہ اس کے دل میں سخت

موجود تھی کہ وہ بالکل اُس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی جس کے متعلق ڈر رہا کرتا ہے کہ اب گرا اور اب گرا ـــــ وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان کی چوٹی پر پہونچ چکی تھی اور اب تمام گاؤں والے اُس کی اُفتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی تھی ـــــ

رحمان کو بھی اِس اُفتاد کا یقین تھا مگر اُس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اُسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں، نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔

جب رحمان دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہونچنے کیلئے تیار ہو کر تکیئے سے باہر نکلا تو اُسے راستے میں نیتی کا خیال آیا مگر اُس وقت اُس نے یہ نہ سوچا کہ سُندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے۔ وہ دراصل نیتی کے تصور میں اِس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اُس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے پیار محبت کر رہا تھا کہ اُسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا۔ البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا تو ایکا ایکی اُس نے سوچا کہ نیتی کو تو بتا دینا چاہیئے تھا کہ سُندر جاٹ آ رہا ہے۔ لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں تکیئے سے باہر نکلا۔ اُس کے مُنہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کُرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ تکیئے سے نکل کر بدھا کھیتوں کا رُخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گذار دیتا تھا۔ شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو اُن کے چلنے سے جو دُھول اُڑتی ہے اُس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آجاتی تھی۔ گاؤں اُس کو پسند نہیں تھا۔ اُجاڑ اور سنسان جگھوں سے اُسے غیر محسوس طور پر محبت تھی یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اُس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے۔ جب برسات میں

دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اُس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کیلئے دعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اُس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ نوجوان چھوکریاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اُس کے سامنے اپنی محبّت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ اُن کے "ماہیا" کا دل کیسا ہے۔ عبدالغفّار ان سوالیوں کو اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا اس لئے کہ اُسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں، لیکن لوگ جو اُس کے پاس سوال لیکر آتے تھے اُس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈھ لیا کرتے تھے۔

عبدالغفّار مختلف کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اُس کنویں کے پاس پہونچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا۔ اس کنویں کی حالت بہت ابتر تھی، اُس بوڑھے برگد کے پتّے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر اس میں جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی مکڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بُن دیا ہے۔ اس کنویں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر عبدالغفّار بیٹھ گیا اور دوپہر کی اُداس فضا میں اُس نے اپنے وجود سے اور بھی اُداسی پیدا کر دی۔

دفعتاً اُڑتی ہوئی چیلوں کی اُداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اُٹھی اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ کوئی گا رہی تھی:۔

ماہیا مرے نے باگ لوایا　　　چمپا، مرہ وا خوب کھلایا

اسی تے لوایاں کھٹیاں وے

راتی سونمڑ نہیں دیندیاں کھیاں وے

اِس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی میرے چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے، اُس میں ہر طرح کے پھول اُگاتے ہیں، چمپا، مروا وغیرہ کھلائے ہیں۔ اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں ـــــ رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں۔ کتنی انکساری برتی گئی ہے۔ معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں، اور پھر شب خوابی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبدالغفار میں نازک جذبات بالکل نہیں تھے لیکن پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اُس کو چونکا دیا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس نے پہچان لیا تھا کہ یہ آواز نیتی کی ہے۔

گاتی گاتی نیتی کنوئیں کی طرف آنکلی۔ غفار کو دیکھکر وہ دوڑی ہوئی اُسکے پاس آئی اور کہنے لگی "اوہ، غفار سائیں...... تم...... اوہ، مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں...... اور اِس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں...... دیکھو میں تمہارا مُنہ میٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی اور ...... لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو...... اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے"

وہ اُس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اُس کے میلے کُرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ خلافِ معمول کبوتروں والا سائیں مسکرایا مگر نیتی اُس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی، اُس کی نگاہیں کاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں کھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اُس نے گردن اُٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا۔

"غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں...... میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرے دل کا حال کیا سمجھو گے!...... اللہ میاں کی محبت اور اُس کے

بندے کی محبت ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی ـــــ کیوں غفار سائیں..... ارے تم بولتے کیوں نہیں ـــــ کچھ بولو ـــــ کچھ کہو..... اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی......
تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں...... تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی......" یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھ گئی۔ اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایکاایکی عبدالغفار سے پوچھا "سائیں، میں کب تھکوں گی؟"

عبدالغفار کے منہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا۔ اس نے کنوئیں کے اندر جھک کر دیکھتے ہوئے جواب دیا "بہت جلد!"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر نیتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا "کب؟ ـــــ کب؟ ـــــ سائیں کب؟"

عبدالغفار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور ببول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ نیتی کچھ دیر کنوئیں کے پاس سوچتی رہی پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا ادھر چلدی۔

وہ رات جس میں سندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آرہا تھا مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی۔ ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ رحمان کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا۔ اتو پہلوان کبھی کبھی تکیے میں آگ تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا، چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں ہی نے کھلایا تھا۔

تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل

ہوتے تھے۔ مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اُس کو ہلکی سی آہٹ بھی سُنائی نہ دی۔ جب رات گذر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سُندر جاٹ کی بابت سوچتی سوچتی سو گئی۔

چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوئی تھی اِس لئے صبح بہت دیر کے بعد جاگی۔ کوٹھڑی سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اُس نے دیکھا کہ ابّو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکیئے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اُس نے باہر نکلتے ہی اُس سے کہا "ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ یہ موا بڑھاپا بڑا تنگ کر رہا ہے۔ صبح سوئی ہوں اور اب اُٹھی ہوں۔۔۔۔ ہاں تم سُناؤ کل کہاں رہے؟"

ابّو نے جواب دیا۔ "گاؤں میں"

اس پر مائی جیواں نے کہا "کوئی تازہ خبر سناؤ"

ابّو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر اور جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا۔ "آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گام جمارہ کی وہ لونڈیا۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟ —— ہاں وہ نیتی کہیں بھاگ گئی ہے؟ —— میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔ حرام زادی نے سارا گاؤں سر پر اُٹھا رکھا تھا"

"وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اُٹھا کر لے گیا ہے؟"

"جائے میری بلا۔۔۔۔۔ لیکن میرے خیال میں تو وہ خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے"

مائی جیواں کو اِس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا۔ سُندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا۔ یہ ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سُندر جاٹ سے متعلق ہو جائے۔ چنانچہ وہ اُن تمام

لوگوں سے نیستی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ تکیئے میں آتے جاتے رہے۔ لیکن جو کچھ ابّو نے بتایا تھا اُس سے زیادہ اُسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔

شام کو رحمان لوٹ آیا۔ اُس نے آتے ہی ماں سے سندر جاٹ کے ڈاکہ کے متعلق پوچھا۔ اس پر مائی جیواں نے کہا۔ "سندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا پر نیستی کہیں غائب ہو گئی ہے —— ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔"

رحمان کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کی ٹانگوں میں دس کوس اور چلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔

ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر مائی جیواں نے تشویشناک لہجہ میں اس سے پوچھا "کیا ہوا بیٹا؟"

رحمان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا "کچھ نہیں ماں۔ ...... تھک گیا ہوں۔"

"اور نیستی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟"

رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے مُنہ کا لُعاب پوچھ رہا تھا۔ رحمان نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا۔ "کیا کہا تھا اُس نے تجھ سے؟"

عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔ "کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں ...... پر اب وہ تھک جائے گی۔"

رحمان نے تیزی سے پوچھا۔ "کیسے؟"

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مُسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "مجھے کیا معلوم؟ ...... سندر جاٹ جانے اور وہ جانے۔"

یہ سُنکر رحمان کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھا گئی اور مائی جیواں
کی جُھرّیاں زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔



اُلّو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا۔ راستے میں، یہ اُسکو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہے۔ بس صرف ایک بار غصّے میں یا طنزیہ انداز میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کہدے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی بڑی انوکھی خواہشیں پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی وہ بہت خوش تھا۔ رات اُسکو بڑی پیاری نیند آئی تھی۔ وہ خود کو بہت ترو تازہ محسوس کر رہا تھا لیکن پھر یہ خواہش کیسے اُس کے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اُس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑے چھل گئے۔ دراصل وہ سوچتا رہا کہ یہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

بیوی سے وہ بہت خوش تھا۔ ان میں کبھی لڑائی نہ ہوئی تھی نوکروں پر بھی وہ ناراض نہیں تھا۔ اسلیئے کہ غلام محمد اور نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار تھا۔ فروری کے سُہانے دن تھے۔ جن میں کنوارے پنے کی تازگی تھی۔ ہوا خنک اور ہلکی۔ دن چھوٹے

نہ راتیں لمبی۔ نیچر کا توازن بالکل ٹھیک تھا اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش اُس کے دل میں کیوں کر پیدا ہوگئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو اُلّو کا پٹھا کہا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اُس نے بعض موقعوں پر استعمال کئے ہوں اور گندی گالیاں بھی دی ہوں مگر اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اُس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اب اچانک طور پر اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدّت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اُس نے اگر کسی کو اُلّو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا ہرج ہو جائے گا۔

دانت صاف کرنے کے بعد اُس نے چھلے ہوئے مسوڑوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا۔ مگر دیر تک اُنکو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی جو ایکا ایکی اُس کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا۔ وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا۔ آئینہ میز پر رکھکر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔

"مان لیا کہ میرا کسی کو اُلّو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔ مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوئی۔۔۔۔۔۔ میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کیوں کہوں؟ ــــ میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔"

یہ سوچتے سوچتے اُسکی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقے پر پڑی۔ ایک دم اُس کے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں، عجب واہیات نوکر ہے۔

دروازے کے عین بیچ میں یہ حقّہ ٹِکا دیا ہے۔ میں ابھی اِس دروازے سے اندر آیا ہوں، اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چِلم گر پڑتی، تو پا انداز جو کہ مونج کا بنا ہوا ہی جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی......

اُس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے۔ جب وہ بھاگا ہوا اُس کے سامنے آ جائے تو وہ بھرے ہوئے حقّے کی طرف اشارہ کرکے اُس سے صرف اتنا کہے "تم بڑے اُلّو کے پٹھے ہو"۔ مگر اُس نے تامّل کیا اور سوچا "یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر غلام محمد کو اب بُلا کر اُلو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہوگی اور پھر........ اور پھر اس بچارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے۔ میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقّہ پیتا ہوں"۔

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحے کے لئے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ کہ اُس نے اُلّو کا پٹھا کہنے کے لئے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا، غائب ہو گئی۔

دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی۔ پُورے دو گھنٹے پڑے تھے، دروازہ کے پاس کُرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقّہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کئے بغیر حقّے کا دُھواں پیتا رہا اور دھوئیں کے انتشار کو دیکھتا رہا۔ لیکن جونہی وہ حقّے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لئے ساتھ والے کمرے میں گیا تو اُس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔

قاسم گھبرا گیا۔ بھئی حد ہو گئی ہے ـــــ اُلّو کا پٹھا ـــــ میں کسی کو اُلو کا پٹھا کیوں کہوں اور بفرضِ محال میں نے کسی کو اُلو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہوگا.......

قاسم دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خواہش جو اُس کے دل میں پیدا ہوئی ہے بالکل بیہودہ اور بے سر و پا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج تھا۔ کہ دبانے پر وہ اور بھی زیادہ اُبھر آتی تھی۔

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اُلّو کا پٹھا نہ کہے گا۔ خواہ یہ خواہش صدیوں تک اُس کے دل میں تلملاتی رہے شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح اُس کے روشن دل میں چلی آئی تھی۔ اسقدر تڑپ رہی تھی۔"

پتلون کے بٹن بند کرتے وقت جب اُس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلا اُٹھا "بھئی ہو گا...... یہ کیا بیہودگی ہے ......" دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے...... اُلّو کا پٹھا کہو — اُلّو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر سے بند کرنے پڑیں گے"۔ لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا۔ اُس کی بیوی نے چائے بنا کر پیالی اُس کے سامنے رکھدی اور توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا۔ روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی۔ توس اتنے اچھے سنکے ہوئے تھے۔ کہ بسکٹ کی طرح کرکرے تھے۔ اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی۔ خمیر میں سے خوشبو آ رہی تھی۔ مکھن بھی صاف تھا۔ چائے کی کیتلی بے داغ تھی۔ اُس کی مونٹھ کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا۔ مگر آج وہ دھبّہ بھی نہیں تھا۔

اُس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ اُس کی طبیعت خوش ہو گئی۔ خالص دار جلنگ کی چائے تھی۔ جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی۔ دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔

قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا۔ "آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے

اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔"

بیوی تعریف سُنکر خوش ہوئی۔ مگر اُس نے مُنہ بنا کر ایک ادا سے کہا "جی ہاں بس آج اتفاق سے اچھی بنگئی ہے ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھول کے پلائی جاتی ہے...... مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے ــــ سلیقے والیاں تو وہ موٹی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں جن کے آپ ہر وقت گُن گایا کرتے ہیں۔"

یہ تقریر سُنکر قاسم کی طبیعت مکدّر ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے اُسکے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر اُلٹ دے اور وہ نیم جو اُس نے اپنے بچّے کی پھنسیاں دھونے کے لئے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے میں پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اُس نے بُردباری سے کام لیا "یہ عورت میری بیوی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسکی بات بہت ہی بھونڈی ہے۔ مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بنکر ایسی بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں۔ اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سُنتی ہیں؟ بالکل ایسی ادنیٰ قسم کی باتیں اور اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں...... میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے۔ یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہدیتی ہے، اُس کی نیّت نیک ہوتی ہے۔ بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں۔"

یہ سوچکر قاسم نے اپنی نگاہیں اُس طاقچے پر سے ہٹالیں جس میں نیم کے پتّے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رُخ بدل کر اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، آج نیم کے پانی سے بچّے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا۔ نیم زخموں کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے"...... اور دیکھو، تم موسمبیوں کا رس ضرور پیا کرو...

......میں دفتر سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤنگا۔ یہ رس تمہاری صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔

بیوی مُسکرادی "آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے.... اچھی بھلی تو ہوں، کھاتی ہوں، پیتی ہوں، دوڑتی ہوں، بھاگتی ہوں..... میں نے جو آپ کے لئے بادام منگوا کے رکھے ہیں...... بھئی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے بغیر نہ رہوں گی...... لیکن دفتر میں کہیں بانٹ نہ دیجئے گا"

قاسم خوش ہو گیا کہ چلو موسمیوں کے رس اور باداموں نے اُسکی بیوی کے مصنوعی غصّے کو دُور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا۔ جو اُس نے پڑوس کے پُرانے شوہروں سے سیکھے تھے۔ اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق اُن میں تھوڑا بہت ردّ و بدل کر لیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگایا اور اُٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خواہش نمودار ہو گئی۔ اِس مرتبہ اُس نے سوچا۔ اگر میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا ہرج ہے ـــ زیرِ لب بالکل ہولے سے کہہ دوں، اُلّو..... کا..... پٹھا..... تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی۔ یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بنکر بیٹھ گئی ہے کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں ـــ دفتر میں......"

اُسکو صحن میں بچّے کا کموڈ پڑا نظر آیا۔ یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بدتمیزی تھی اور خصوصاً اُس وقت جب کہ وہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار گرم گرم توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اُسکے مُنہ میں تھا...... اُس نے زور سے آواز دی "غلام محمد"

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی "غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے..... کوئی کام تھا آپ کو اُس سے؟"

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں کہہ دوں، یہ غلام محمد اُلو کا پٹھا ہے....... اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں۔ ...... نہیں...... وہ خود تو موجود ہی نہیں، پھر..... بالکل بیکار ہے..... لیکن سوال یہ ہے کہ بیچارے غلام محمد ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے۔ اُسکو تو میں ہر وقت اُلو کا پٹھا کہہ سکتا ہوں......"

قاسم نے ادھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا "کچھ نہیں میں اُس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے آیا کرے..... تمہیں کھانا جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنا پڑتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو فرش پر اُس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا" یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اُس کا بچہ رینگتا رینگتا آئیگا اور اُسے اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لیگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اُس کے پیٹ میں گڑبڑ مچ جائے گی۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اُٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو اُلو کا پٹھا نہیں کہہ دیا۔ اُس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی ابھی مجھ سے بھی تو ہوئی تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی......

قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اُسے اِس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح طور پر غور و فکر کرنے والا انسان ہے۔ مگر اس احساس نے اُس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اُس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ

احساسِ برتری کو اپنے اندر دبا دیا کرتا تھا۔

موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اُس نے بلا ضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ دراصل کچھ دیر کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔

اُس کی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی۔ قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اُس کے پاس آئی اور کہنے لگی "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

قاسم چونک پڑا۔ کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟ یہ لفظ اُس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اُس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہدے کہ یہ عجیب و غریب خواہش اُس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور سُنے گی اور یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ اُسکو بیوی کا ساتھ دینا پڑیگا، چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش اُس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ مگر اُس نے غور کیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بنجائے...... ایسا ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے کیا ضرور ہو جائیگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار ناخوشگواری پیدا ہو۔ چنانچہ اُس نے اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا اور ایک لمحہ تک اُس کی طرف یونہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اُٹھا کر کونے میں رکھدیا اور کہا۔ "آج صبح آپ کے برخوردار نے وہ ستایا ہے کہ اللہ کی پناہ ——— بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اُسے کموڈ پر بٹھایا۔ اُس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے..... آخر لڑکا کس کا ہے؟......

قاسم کو اس قسم کی تیز مزاحیہ پسند تھی۔ ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاج کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اُس نے بیوی سے کہا۔ "لڑکا میرا ہی ہے مگر...... میں نے تو آج تک کبھی بستر خراب نہیں کیا۔ یہ عادت اُس کی اپنی ہو گی"۔

بیوی نے اُس کی بات کا مطلب نہ سمجھا۔ قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا، اس لئے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے مُنہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لئے کیا کرتا تھا۔ وہ اور بھی خوش ہوا۔ جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئی۔

"اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں۔ خدا حافظ!"

یہ لفظ جو ہر روز اُس کے مُنہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چلدیا۔

کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اُسے ایک داڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اُسکو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ "لو بھئی، یہ آدمی ہے جس کو اُلّو کا پٹھا کہہ دینا چاہیئے...... یعنی جو صحیح معنوں میں اُلّو کا پٹھا ہے...... ذرا انداز ملاحظہ کرو...... کس انہماک سے ڈرائی کلین کئے جا رہا ہے...... جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام دے رہا ہے...... لعنت ہے"۔

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اُس نے تعجیل سے کام نہ لیا اور تھوڑی دیر غور کیا۔ "میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر، اگر میں نے بلند آواز میں بھی اُسکو اُلّو کا پٹھا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اس لئے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بُری طرح مصروف ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ اُسکے کان کے

پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اُٹھے تو اُسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، قبلہ آپ اُلو کے پٹھے ہیں...... لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو گا۔"

چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اِسی اثنا میں اُس کے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اُس پر سوار تھی۔ اِس لئے کہ پیچھے بستہ بندھا تھا۔ آناً فاناً اُس لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں میں پھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیے کا بریک دبا یا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔

قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام لیا۔ اس لئے کہ اُس نے اِس حادثہ کے ردِعمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا مگر جب اُس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اُس کا بورڈر بہت بُری طرح اُن میں اُلجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اُس نے سائیکل کا پچھلا پہیہ ذرا اونچا اُٹھایا تاکہ اُسے گھما کر ساڑھی کو فری وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پہیہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں کی لپیٹ میں آئی۔ کہ اُدھر پیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی۔ قاسم بوکھلا گیا۔ اُس کی اِس بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا۔ زور سے اُس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا۔ فری وہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑا رہ گیا۔ اور ساڑھی باہر نکل آئی۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا تھا۔ قاسم کی طرف اُس نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "اُلو کا پٹھا!"

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا۔ اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہو گئی!"

قاسم کو لڑکی کی گالی سُنکر بہت دُکھ ہوا خاص کر اس لئے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ بہت صحیح الدماغ آدمی تھا۔ ٹھنڈے دل سے اُس نے اس حادثہ پر غور کیا اور اُس لڑکی کو معاف کر دیا۔ "اُسکو معاف ہی کرنا پڑیگا۔ اس لئے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ اور اُن عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اُس نے اپنی لمبی جُراب میں اُوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اُڑس رکھے تھے؟"

نامکمل تحریر

میں جب کبھی ذیل کا واقعہ یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔

ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ جس کے باعث موسم خنک ہو گیا تھا۔ جب میں صبح سویرے غسل کیلئے ہوٹل سے باہر نکلا تو "دھلی ہوئی پہاڑیوں اور نہائے ہوئے ہرے بھرے پیڑوں کی تازگی دیکھ کر طبیعت پر وہی کیفیت پیدا ہوئی جو خوبصورت کنواریوں کے جھرمٹ میں بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔"

"بارش بند تھی البتہ ننھی ننھی پھوار پڑ رہی تھی۔ پہاڑیوں کے اونچے اونچے درختوں پر آوارہ بدلیاں اونگھ رہی تھیں گویا رات بھر برسنے کے بعد تھک کر چُور چُور ہو گئی ہیں۔"

میں چشمے کی طرف روانہ ہوا۔ کاندھے پر تولیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں صابن دانی تھی، دوسرے میں نیکر۔ جب سڑک کا موڑ طے کرنے لگا تو آنکھوں کے سامنے دھند ہی دھند نظر آئی۔ بادل کا ایک بھولا بھٹکا ٹکڑا تھا جو شاید آسمانی فضا سے اکتا کر ادھر آ نکلا تھا۔ اس بادل نے سڑک کے دوسرے حصے کو آنکھوں سے بالکل اوجھل کر دیا تھا۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی سپیدی ہی سپیدی نظر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ اوپر سے کوئی دھنکی ہوئی روئی

بکھیر رہا ہے۔

اتنے میں ہوا کے تیز جھونکوں نے اس سپیدی میں ارتعاش پیدا کیا اور اس دھند میں سے دُودھ مثال بُخارات علیحدہ ہونے لگے اور میری ننگی باہوں سے مَس ہوئے۔ برف سے اُٹھتے ہوئے دُھوئیں کی سردی کے احساس سے وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اُن بُخارات نے پیدا کی۔

اس بادل میں سے گذرتے وقت سانس کے ذریعے سے یہ سپید سپید بُخارات میرے اندر داخل ہو گئے جس سے پھیپھڑوں کو بڑی راحت محسوس ہوئی۔ میں نے جی بھر کے اس سے لُطف اُٹھایا۔ جب بادل کے اس ٹکڑے کو طے کر کے میں باہر آیا تو آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ میرے چشمے کے شیشے کاغذ کے مانند سفید ہو گئے تھے۔ پھر ایکا ایکی مجھے سردی محسوس ہونے لگی اور جب میں نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو وہ شبنم آلود تکیے کی طرح گیلے ہو رہے تھے۔

میں غُسل کے معاملے میں بے حد سُست ہوں اور سردیوں کے موسم میں تو روزانہ غُسل کا میں بالکل قائل نہیں۔ دراصل نہانے دھونے کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا ہے۔ غُسل کا مطلب یہ ہے کہ غلاظت دُور کی جائے اور روز نہانے کا یہ مطلب ہوا کہ آدمی رات . . . میں غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ مُنہ دھو لیا جائے، پیر صاف کر لئے جائیں، سر کے بال دھو لئے جائیں اس لئے کہ یہ سب چیزیں جلدی میلی ہو سکتی ہیں مگر یہ ہر روز بدن کیوں صاف کیا جائے جب کہ یہ بہت دیر کے بعد میلا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو خیر میں نہانے کا مطلب سمجھ سکتا ہوں مگر سردیوں میں اس کا کوئی مصرف مجھے نظر نہیں آتا۔ آخر کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہر روز صبح سویرے انسان غُسل خانے میں جائے۔

سردی کے مارے پورے دو گھنٹوں تک دانت بجتے رہیں۔ انگلیاں سُن ہو جائیں، ناک برف کی ڈلی بن جائے ـــــ غسل نہ ہوا، اچھی خاصی مصیبت ہوئی۔

غسل کے بارے میں اب بھی میرا یہی خیال ہے، لیکن جس پہاڑی گاؤں کا میں ذکر کر رہا ہوں وہاں کی فضا ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ جو چیزیں مجھے اب مہمل نظر آتی ہیں، یا اس سے پہلے نظر آیا کرتی تھیں وہاں بامعنی دکھائی دیتی تھیں ـــــ اس غسل ہی کو لیجئے۔ اُس پہاڑی گاؤں میں جتنا عرصہ میں رہا ہر روز میرا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ نہاؤں اور دیر تک نہاتا رہوں۔

چشمے پر پہونچ کر میں نے کپڑے اُتارے۔ نیکر پہنی اور جب پانی کی اُس گرتی ہوئی دھار کے پاس گیا جو پتھروں پر گر کر ننھے ننھے چھینٹے اُڑا رہی تھی تو پانی کی ایک سرد بوند میری پیٹھ پر آ پڑی۔ میں تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ جہاں بوند گری تھی اُس جگہ گدگدی پرکار کی نوک کی طرح چُبھی اور سارے جسم پر پھیل گئی۔ میں سمٹا، کانپا اور سوچنے لگا۔ مجھے واقعی نہانا چاہیئے یا کہ نہیں۔ قریب تھا کہ میں باغی ہو جاؤں لیکن آس پاس نگاہ دوڑائی تو ہر شے نہائی ہوئی نظر آئی چنانچہ جو باغیانہ خیال میرے دماغ میں اُس شریر بُوند نے پیدا کئے تھے ٹھنڈے ہو گئے۔

سرد پانی کی گدگدیاں شروع شروع میں تو مجھے بہت ناگوار گذریں مگر جب میں جی کڑا کر کے دھار کے نیچے بیٹھ گیا تو وہ لُطف آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ زور زور سے پانی کے چھینٹے اُڑانے سے سردی کی شدّت کم ہو جاتی تھی، چنانچہ جب میں نے یہ گُر معلوم کر لیا تو پھر اُس لُطف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

سر پر پانی کی موٹی دھار نے عجب کیفیت پیدا کر دی۔ پھر جب پانی کے

دباؤ سے بال پیشانی پر سے نیچے لٹک آئے اور اُنہوں نے آنکھوں اور مُنہ میں گھُسنا شروع کر دیا تو زور زور سے پھونکیں مار کر ان کو ہٹانے کی ناکام سعی نے مزا اور بھی دو بالا کر دیا۔ کبھی کبھی ڈوب کر اُبھرتے ہوئے آدمی کا احساس بھی مجھے ہوا اور میں نے سوچا کہ جو لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں اُنکو ایسی موت میں بے حد لُطف آتا ہو گا۔ چشمے کا پانی آنسوؤں کی طرح شفاف تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اردگرد بُلبُلوں اور پانی کے چھینٹوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔"

غُسل سے فارغ ہو کر میں نے تولیے سے بدن پونچھا اور سردی کا احساس کم کرنے کے لئے دھیمے دھیمے سُروں میں ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یہ سُریلی گنگناہٹ ہوا کے جھونکوں سے مرتعش ہو جاتی اور میں یہ سمجھتا کہ میرے بجائے کوئی اور آدمی بہت دُور گا رہا ہے، اس پر میں تولیے کو زیادہ زور کے ساتھ بدن پر ملنے لگتا۔

بدن خُشک ہو گیا تو میں نے کپڑے پہنے۔ اِس اثنا میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میرے عین اوپر بادل کا ایک اسفنج نما ٹکڑا چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پہاڑی پر سے نیچے اُترنا شروع کیا اور فوراً ہی کودتا پھاندتا سڑک میں اُتر آیا۔ متوقع بارش سے بچنے کے لئے میں نے قدم تیز کر دئے لیکن ابھی سڑک پر بمشکل ایک جریب کا فاصلہ طے کرنے پایا تھا کہ "اے بکری بکری" کی آواز بلند ہوئی پھر اس کے ساتھ ہی دُور پہاڑیوں نے اِس آواز کو دبوچ کر دو بارہ ہوا میں اُچھال دیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بھی اِس آواز کو گیند کی طرح بوچ لوں مگر ہمیشہ کے لئے اپنی جیب میں ڈال لوں۔"

میں ٹھیر گیا۔ وہی مانوس دل نواز صدا تھی جو اس سے قبل میں کئی مرتبہ سُن چکا تھا۔ بظاہر "اے بکری بکری" تین معمولی لفظ ہیں اور کاغذ پر یہ کوئی ایسا تصور پیش نہیں کرتے جو انوکھا اور حسین ہو مگر واقعہ ہے کہ میرے لئے اِن میں وہ سب کچھ تھا جو روح کو مسرور کر سکتا ہے۔ جونہی یہ آواز میری سماعت سے مس ہوتی مجھے یہ معلوم ہوتا کہ پہاڑ کی چھاتی میں سے صدیوں کی رُکی ہوئی آواز نکلی ہے اور سیدھی آسمان تک پہونچ گئی ہے۔

"اے" بالکل دھیمی آواز میں اور "بکری بکری" بلند اور فلک رس سُروں میں۔ ایک لمحہ کے لئے یہ نعرۂ شباب پہاڑیوں کی سنگین دیواروں میں گونجتا ڈوبتا، اُبھرتا، تھرتھراتا اور رباب کے تاروں کی آخری لرزش کی طرح کانپتا فضا میں گھل مل جاتا۔

کالی کالی بدلیاں چھا رہی تھیں۔ فضا نم آلود تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں اِس نمی نے غنودگی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میں نے اوپر پہاڑی پر اُگی ہوئی ہری ہری جھاڑیوں کی طرف دیکھا اور اُن کے عقب میں مجھے دو تین سفید بکریاں نظر آئیں ـــــ میں نے اُوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ ایک مُنہ زور بکری ونیرہ کو گھسیٹے لئے جا رہی تھی اور وہ اُس کو ڈانٹ بتانے کے لئے "اے، بکری بکری" پکار رہی تھی۔ اُس کا منہ غصہ اور زور لگانے کے باعث پگھلے ہوئے تانبے کی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی کو پوری طاقت سے کھینچنے میں اُس کا سینہ غیر معمولی طور پر تن گیا تھا۔ سر پیچھے جھکا تھا۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے، کمر پر سے دوپٹہ اُتر کر باہوں میں چلا آیا تھا۔ پیشانی پر سیاہ بالوں کی لٹیں بل کھاتی

ہوئی سنہو فیلں معلوم ہو رہی تھیں

ایک سبز جھاڑی کے پاس پہونچ کر بکری دفعتہً ٹھیر گئی اور اُس کے نرم نرم پتّوں کو اپنی تھوتھنی سے سونگھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر وزیر نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا اُترا ہوا دوپٹہ ایک بڑے سے پتھر پر رکھ کر اُس نے پاس والے درخت کے تنے سے بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی باندھی اور دوسرے پیڑ کی جھکی ہوئی ٹہنی پکڑ کر جھولا جھولنے لگی۔

"میں جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا تھا" بازو اُوپر اُٹھانے کے باعث اُس کی کھلی آستینیں نیچے ڈھلک آئیں۔ کپڑے کے یہ چھلکے سے جب اُترے تو اُسکے بازو کندھوں تک عُریاں ہو گئے۔ بڑی خوبصورت باہیں تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کے دو بڑے دانت اُوپر کو اُٹھے ہوئے ہیں بے داغ، ہموار اور زندگی سے بھرپور۔"

وہ جھولا جھول رہی تھی اور اُس کے دونوں بازو کچھ اس انداز سے اوپر کی جانب اُٹھے ہوئے تھے کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا وہ آسمان کی طرف پرواز کر جائے گی۔ جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر میں اُس کے سامنے آگیا۔ دفعتہً اُس نے میری طرف نگاہیں اُٹھائیں۔ سٹ پٹائی، ٹہنی کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ گری، سنبھلی اور حلق میں سے ایک مدھم چیخ نکالتی دوڑ کر دوپٹہ لینے کے لئے پتھر کی طرف بڑھی —— مگر دوپٹہ میری بغل میں تھا۔

اُس نے دوپٹہ کی تلاش میں یہ جانتے بُوجھتے کہ وہ میری بغل میں ہے، اِدھر اُدھر دیکھا اور مسکرا دی۔ اُس کی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے اُبھر آئے۔ گال اور سُرخ ہو گئے۔ اور سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں

بازوؤں کی مدد سے اُس نے اپنے سینے کی شوخیوں کو چھپا لیا اور انہیں اور زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی وہ پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس پر بھی جب اُسے اطمینان نہ ہوا تو اُس نے گھٹنے اُوپر کر لئے اور بگڑ کر مجھ سے کہنے لگی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میرا دوپٹہ لا دیجئے"

میں بڑھا اور بغل میں سے دوپٹہ نکال کر اُس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ مجھے اُس کے بیٹھنے کا انداز بہت پسند آیا چنانچہ میں بھی اُسی طرح اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وزیر جوان آواز وں کا ایک بہت بڑا انبار ہے اور میں ...... اور میں خدا معلوم کیا ہوں۔ اُس کو ہاتھ لگاؤں گا تو وہ باجے کی طرح بجنا شروع ہو جائے گی۔ ایسے سُر اس میں سے نکلیں گے جو مجھے اوپر بہت اوپر لے جائیں گے اور زمین اور آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق کر دیں گے جہاں میں کوئی آواز سُن نہ سکونگا۔

وزیر نے مجھے جنگلی بلی کی طرح گھور کر دیکھا گویا کہنا چاہتی ہے۔ اب جاؤ یہاں دھرنا دے کر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ میں نے اُس کے اس خاموش حکم کی کوئی پروا نہ کی اور کہا:۔

چشمے سے واپس آ رہا تھا کہ تمہاری آواز سُنی۔ بے اختیار کھنچا چلا آیا۔

وزیر۔ تمہاری یہ آواز مجھے یقیناً پاگل بنا دے گی — جانتی ہو پاگل آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں:۔"

میری یہ بات سُن کر اُس کو حیرت ہوئی۔ "یہ کیا پاگل پن ہے — میری آواز کسی کو کیوں پاگل بنانے لگی!"

میں نے کہا۔ "جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو...... دُنیا میں یہ راگ راگنیاں کہاں سے آئی ہیں ...... لیکن چھوڑو اس قصے کو۔ یہ بتاؤ، میری ایک بات

مانو گی؟"

"مان لوں گی، پر آپ یہ تو کہیئے بات کیا ہے؟"

"ایک دفعہ میری خاطر اے، بکری بکری! کا نعرہ بلند کر دو"

مجھے ہاتھ سے دھکا دے کر اُس نے تیز لہجہ میں کہا۔ "یہ کیا پاگل پن ہے، بنانے کے لئے ایک صرف میں ہی رہ گئی ہوں۔"

"وزیرا بخدا میں تمہیں بنا نہیں رہا۔ مجھے تمہاری یہ آواز پسند ہے — جھوٹ کہوں تو......... لے اب مان بھی جاؤ — بس ایک بار!"

"جی نہیں۔"

"میں تم سے التجا کرتا ہوں۔"

"میں نے یہ آوازہ نہ کبھی نکالی ہے اور نہ اب نکالوں گی۔"

"میں ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں۔"

"یا اللہ — یہ کیا مصیبت ہے۔" وزیر نے اپنا بدن سکیڑ لیا۔ "اور اگر میں نہ مانوں تو...... یعنی یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میں اسی وقت آپ کے کہنے پر بیکار چلانا شروع کر دوں — آپ تو خواہ مخواہ چھیڑ خانی کر رہے ہیں اور میں نگوڑی جانے کیا سمجھ رہی ہوں — بھئی ہو گا، ہمیں یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔"

"وزیرا!" میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میری طرف دیکھو...... میرے چہرے سے تم اِس بات کا اطمینان کر سکتی ہو کہ میں ہنسی مذاق نہیں کر رہا۔"

اُس نے میرے چہرے کی طرف مصنوعی غور سے دیکھا اور میری ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔ "آپ کی ناک پر یہ ننھا سا تل کتنا بھلا دکھائی دیتا ہے۔"

اُس وقت میرے جی میں آئی کہ اُس پتھر پر جس پر وہ بیٹھی ہوئی ہے میں اپنی ناک گھسنا شروع کر دوں تاکہ وہ ننّھا سا تِل ہمیشہ کے لئے مِٹ جائے۔ وزیرہ نے میری طرف دیکھا تو وہ یہ سمجھی کہ میں رُوٹھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، چنانچہ اُس نے فوراً اپنی بکریوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا۔ "بابا، آپ خفا نہ ہوجیے۔۔۔۔"

قریب تھا کہ وہ اپنی مخصوص آواز بلند کرے کہ ایکا ایکی جھجک اُس پر غالب آگئی۔ بہت زیادہ شرما کر اُس نے اپنی گردن جُھکا لی" پر میں پوچھتی ہوں، اس میں خاص بات ہی کیا ہے!"

میں نے بگڑ کر کہا۔ "وزیرہ، تم اب باتیں نہ بناؤ۔"

دوسری طرف مُنہ کرکے اُس نے ایکا ایکی بلند آواز میں "اے بکری بکری" پکارا اس کے بعد شرمیلی ہنسی کا ایک فوّارہ سا اُس کے مُنہ سے چھوٹ پڑا، اِن بلندیوں میں پرواز کر گیا ——— کتنی صاف اور شفاف آواز تھی۔ دُھلی ہوئی فضا میں اُس کی گونج دیر تک دُور، نظر سے اوجھل ہو جانے والے پرندوں کے پروں کی طرح چمکتی رہی، پھر جذب ہوگئی۔

وزیرہ کی طرف میں نے دیکھا۔ اب وہ خاموش تھی! اُس کا چہرہ غیر معمولی طور پر صاف تھا۔ آنکھیں نہاتی ہوئی چڑیوں کی طرح بے قرار تھیں ہنسنے کے باعث اُن میں آنسو بھر آئے تھے۔ ہونٹ اس انداز سے کُھلے ہوئے تھے کہ میرے ہونٹوں میں سرسراہٹ پیدا ہوگئی ——— خدا معلوم کیا ہوا۔۔۔۔ میں نے وزیرہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اُس کا سر میری گودی میں ڈھلک آیا ——— لیکن ایکا ایکی زور سے وہ اپنا بازو میرے جُھکے ہوئے سر اور اپنے متحیر چہرے کے درمیان لے آئی اور دھڑکتے ہوئے لہجہ میں کہنے لگی "آہ ہٹائیے، ہٹائیے اِن ہونٹوں کو!"

میری گود سے نکل کر وہ بھاگ گئی اور میرے ہونٹوں کی تحریر نامکمل رہ گئی۔

اِس واقعہ کو ایک زمانہ گذر چکا ہے مگر جب کبھی میں اِسکو یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سُوئیاں سی چُبھنے لگتی ہیں ——— یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں میں اٹکا رہے گا۔"

———

قبض

نئے لکھے ہوئے مکالمے کا کاغذ میرے ہاتھ میں تھا۔ ایکٹر اور ڈائرکٹر کیمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے۔ شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس لئے کہ اسٹڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا۔ ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا۔ کیونکہ شوٹنگ کے دوران میں جب ایکا ایکی اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی۔ تو کئی کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بیکار ہو جاتا۔ اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔

ڈائرکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کیمرے کے پاس کھڑے سگرٹ پی رہے تھے اور میں سستانے کی خاطر کرسی پر ٹانگوں سمیت بیٹھا تھا وہ یوں کہ میری دونوں ٹانگیں کرسی کی نشست پر تھیں اور میرا بوجھ نشست کی بجائے اُن پر تھا۔ میری اس عادت پر بہت لوگوں کو اعتراض ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔"

جینا جس کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں ڈائرکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا "صاحب، وہ بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے۔ پھر شور بند ہو جائے گا۔"

یہ روزمرّہ کی بات تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور اُن پر ٹھپّے لگتے رہیں گے۔ چنانچہ ڈائرکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹڈیو سے باہر چلے گئے۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا۔

سقفی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں پڑیں تھیں اُن کا درمیانی فاصلہ اصلی فاصلے پر کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور گیروے رنگ کے کھُری پلائی وڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے پست قد دکھائی دیتے تھے۔ میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی۔

"السلام علیکم!" میں نے جواب دیا "وعلیکم السلام" اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی۔ میری آنکھوں میں "تم کون ہو؟" کا سوال تیرنے لگا۔ آدمی ہوشیار تھا، فوراً کہنے لگا۔ "جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں ——— میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔ خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں ——— آپکا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے!"

میں نے کہا "جی نہیں ——— میں پنجاب کا باشندہ ہوں۔"

عبدالرحمٰن نے جیب سے عینک نکالی۔ "معاف فرمائیے گا، چونکہ ڈائرکٹر صاحب نے عینک اُتار دینے کا حکم دیا تھا۔ اس لئے........"

اِس دوران میں اُس نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکالی اور میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ "واللہ، میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں ——— ماشاءاللہ کیا مکالمہ لکھا ہے..... قلم توڑ دیا ہے واللہ....... یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے؟"

عبدالرحمٰن نے جب یہ باتیں کیں تو اُس کا قد بھی میری نظر میں کھُری پلائی وڈ

کے تختوں کی طرح پست ہوگیا۔ میں نے رُو کھے پن کے ساتھ کہا۔"جی نہیں"۔

وہ اور زیادہ لچکیلا ہوگیا۔"عجب زمانہ ہے صاحب، جو اہلیتوں کے مالک ہیں اُن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں .... یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا عجب اوٹ پٹانگ زبان بولتے ہیں یہاں کے لوگ، پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہوگئے ہیں مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہوگیا ہوں ـــــ آج آپ سے ملاقات ہوگئی ......"اس کے بعد اُس نے اپنے ہاتھ مل کر اُس روغن کی مرُوڑیاں بنانا شروع کردیں۔ جو چہرے پر لگاتے وقت اُس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف"جی ہاں"کردیا اور وہ خاموش ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور رواروی میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظرِ ثانی شروع کردی۔ چند غلطیاں تھیں۔ جن کو دُرست کرنے کے لئے میں نے اپنا قلم نکالا۔ عبدالرحمٰن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا۔ مجھے اُس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا۔"فرمائیے"۔

اُس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا۔"میں ایک بات عرض کروں"۔

"بڑے شوق سے"۔

آپ اِس طرح ٹانگیں اُوپر کرکے نہ بیٹھا کریں"۔

"کیوں؟"

اُس نے جُھک کر کہا۔"بات یہ ہے کہ اِس طرح بیٹھنے سے قبض ہوجایا کرتا ہے"۔

"قبض؟"میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔"قبض کیسے ہوسکتا ہے"۔ یہ کہکر میرے جی میں آئی کہ اُس سے کہوں مُیاں ہوش کی دوا کرو ـــــ گھانس تو

نہیں کھائے ۔۔۔ مجھے اس طرح بیٹھتے بیس برس ہو گئے ۔۔۔ آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائیگا؛" مگر میں یہ سوچ کر چُپ ہو گیا کہ بات بڑھ جائیگی اور مجھے بیکار کی مغز دردی کرنا پڑے گی۔

وہ مُسکرایا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اُس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سُکڑ گیا "آپ نے مذاق سمجھا ہے حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے۔ مانیں نہ مانیں یہ آپکو اختیار ہے۔"

میں عجب مشکل میں پھنس گیا۔ اس کو اب میں کیا جواب دیتا۔ قبض..... یعنی قبض ہو جائیگا، بیس برس کے دوران میں مجھے قبض نہ ہوا لیکن آج اس مسخرے کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائیگا۔ قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر بیٹھنے سے۔ جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں اُس سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے۔ دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے ساتھ لگا دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑا رہنا پڑتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے۔ دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دُور کرتے ہیں مگر میں تو اسی طریقے سے دُور کرتا ہوں۔ کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ خواہ قبض کے بجائے مجھے سرسام ہو جائے۔ یہ ضد نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا انداز میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں اکثر لوگوں کو میرے اس طرح

بیٹھنے کے انداز پر اعتراض رہا ہے۔ اِس اعتراض کی وجہ نہ میں نے ان لوگوں سے کبھی پوچھی ہے اور نہ اُنہوں نے کبھی خود بتائی ہے۔ اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو میں اِس معاملے میں اچھی سے اچھی دلیل سُننے کے لئے بھی تیار نہیں کوئی آدمی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمٰن نے مجھ پر نکتہ چینی کی تو میں بھنا گیا اور اُس کا یوں شکریہ ادا کیا جیسے کوئی یہ کہے "لعنت ہو تم پر۔"

اِس شکریئے کی رسید کے طور پر اُس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر میلی سی مُسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا۔ اتنے میں ڈائرکٹر ہیرو اور ہیروئن آ گئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے سے عبدالرحمٰن کے قبض سے نجات حاصل ہوئی۔

اُس کی پہلی مُلاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں۔

(۱) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغد ہے۔

(۲) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

(۳) یہ ایکسٹرا جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پرلے درجے کا مغز چاٹ ہے۔

(۴) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے بے حد نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی زندگی کچھ عرصے کے لئے زیادہ متحرک ہو جائے گی۔ میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں۔ آپ پوچھیں گے بھلا نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ ہر کام کرنے کے لئے ایک خاص سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے اور نفرت میں چونکہ شدّت زیادہ ہے

اِس لئے اِس کے عامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے۔ محبت ایک عام چیز ہے حضرت آدم سے لیکر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے اور جنہوں نے کی ہے اُن میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا۔ نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے۔" محبت میں مٹھاس ہے جو اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے جو دل کا قوام دُرست رکھتی ہے۔"

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اِس طریقے سے کرنا چاہیئے۔ کہ اُس میں محبت کرنے کا مزا ملے۔ شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اس سے سوفی صدی اتفاق ہے۔ یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں۔ اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے تو وہ یقیناً اِس نفرت سے جو کہ اُس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہوگی اور سچ پوچھئے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اگر ہمیں اُس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا تو دُنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمٰن سے نفرت کرنا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اور اُس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی۔ اسٹڈیو میں اور اسٹڈیو کے باہر جہاں کہیں اُس سے میری ملاقات ہوتی میں اُس کی خیریت دریافت کرتا اور اُس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمٰن کا قد متوسط ہے اور بدن گٹھا ہوا۔ جب وہ نیکر پہنکر آتا ہے تو "اُس کی بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے نئے کور کے چمڑے کی طرح چمکتا ہے۔" ناک موٹی جس کی کوٹھی اُبھری ہوئی ہے۔ چہرے کے خطوط منگولی ہیں

ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شیطان لڑکے نے اپنے ڈسک کی لکڑی میں چاقو سے چھوٹا سا گڑھا بنا دیا ہے۔ پیٹ سخت اور اُبھرا ہوا۔ حافظ قرآن ہے چنانچہ بات بات میں آیتوں کے حوالے دیتا ہے۔ کمپنی کے دوسرے ایکسٹرا اُس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کہ انہیں احترام کے باعث چُپ ہو جانا پڑتا ہے۔

ڈائرکٹر صاحب کو جب میری زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن صاف زبان بولتا ہے اور غلطی نہیں کرتا تو انہوں نے اُسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایک ہی فلم میں اُسے دس مختلف آدمیوں کے بھیس میں لایا گیا۔ سفید پوشاک پہنا کر اُسے ہوٹل میں بیرا بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سر پر لمبے لمبے بال لگا کر اور چمٹا ہاتھ میں دے کر ایک جگہ اُس کو سادھو بنایا گیا۔ چپڑاسی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اُس کے چہرے پر گوند سے لمبی داڑھی چپکا دی گئی۔ ریلوے پلیٹ فارم پر بڑی مونچھیں لگا کر اُس کو ٹکٹ چیکر بنا دیا گیا ــــــ یہ سب میری بدولت ہوا! اس لئے کہ مجھے اس سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

عبدالرحمٰن خوش تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ اتنا مقبول ہو گیا اور میں خوش تھا کہ دوسرے ایکسٹرا اُس سے حسد کرنے لگے ہیں۔ میں نے موقعہ دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی چنانچہ تیسرے مہینے اُس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہو گیا۔ اِس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کمپنی کے پچیس ایکسٹراؤں کی آنکھوں میں وہ خار بن کے کھٹکنے لگا۔ لطف یہ ہے کہ عبدالرحمٰن کو اِس بات کی مطلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اُس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے۔ اور میری سفارشوں کے باعث کمپنی کے دوسرے ڈائرکٹر اُس سے کام لینے لگے ہیں۔

فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ میں وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو بھی ایڈٹ کرتا ہوں۔ ایک روز میں نے اپنا اخبار عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں دیکھا۔ جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اُس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ "منشی صاحب ...... یہ رسالہ آپ ہی ......"

میں نے فوراً ہی جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

"ماشاءاللہ، کتنا خوبصورت پرچہ نکالتے ہیں آپ .... کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ آگیا ...... بہت دلچسپ ہے، اب میں ہر ہفتے خریدا کروں گا۔"

یہ اُس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کر دیا، چنانچہ بات ختم ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جبکہ میں اسٹوڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا اپنے اخبار کے لئے ایک کالم لکھ رہا تھا۔ عبدالرحمٰن آیا اور بڑے ادب کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا "فرمایئے۔"

"آپ فارغ ہو جائیں تو میں ......"

"میں فارغ ہوں ـــــ فرمایئے آپکو کیا کہنا ہے۔"

اس کے جواب میں اُس نے ایک رنگین لفافے کو کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھا دی۔ تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اُس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی۔ اس لئے میں اسے روک نہ سکا۔ بعد میں جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عبدالرحمٰن کو یہ ناگوار معلوم ہوئی ہوگی تو میں نے کہا، "عبدالرحمٰن صاحب اتفاق دیکھئے۔ میں صبح

سے پریشان تھا کہ ٹائیٹل پیج کے بعد کا صفحہ کیسے پُر ہوگا۔ دو تصویروں کے بلاک مل گئے تھے۔ مگر ایک کی کمی تھی .... اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا فوٹو میری طرف بڑھا دیا ...... بہت اچھا فوٹو ہے۔ بلاک بھی اِس کا خوب بنے گا۔"

عبدالرحمٰن نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سُکیڑ لیے۔"آپ کی بڑی عنایت ہے...... تو...... تو کیا یہ تصویر چھپ جائے گی؟"

میں نے تصویر کو ایک نظر اور دیکھا اور مُسکرا کر کہا۔"کیوں نہیں ــــ اِس ہفتے ہی کیلئے تو میں یہ کہہ رہا تھا۔"

اِس پر عبدالرحمٰن نے دوبارہ شُکریہ ادا کیا۔"پرچے میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا.... جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں...... تو...... تو ــــ معاف کیجیے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ملتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی، ایک ہاتھ میں بمبئی کی بھاری بھرکم ڈائرکٹری تھی۔ جس پر چھپے ہوئے حروف بتا رہے تھے کہ سن سولہ کی یہ کتاب فوٹو گرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لئے ایک یا دو آنے میں خریدی ہوگی۔ دوسرے ہاتھ میں جو اوپر کو اُٹھا ہوا تھا ایک بہت بڑا پائپ تھا۔ اِس پائپ کی ٹونٹی عبدالرحمٰن نے اِس انداز سے اپنے مُنہ کی طرف بڑھائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا۔ چائے کا پیالہ پکڑے ہے۔ لبوں پر چائے کا گھونٹ پیتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اُس کے ہونٹوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا۔

آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کھُل گئی تھیں، ناک کے نتھنے تھوڑے پھُول گئے تھے۔ سینے میں اُبھار پیدا کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ عبدالرحمٰن انگریزی لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اُس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق ایک تعریفی نوٹ کیساتھ پرچے میں چھپوا دیا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے غلیظ رسٹوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبدالرحمٰن تازہ پرچہ جس میں اُس کی تصویر چھپی تھی ہاتھ میں لئے داخل ہوا اور آداب عرض کر کے میری کرسی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے، آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے۔ بغل میں پرچہ دبا کر اُس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے۔ شکریئے کے کئی فقرے اُس نے دل ہی دل بنائے ہونگے۔ مگر ناموزوں سمجھ کر انہیں منسوخ کر دیا ہوگا۔ جب میں نے اُسے اِس اُدھیڑ بُن میں دیکھا تو ماتم پُرسی کے انداز میں اُس سے کہا "تصویر چھپ گئی آپ کی؟ ...... نوٹ بھی پڑھ لیا آپ نے؟"

"جی ہاں ...... آپ ...... کی بڑی نوازش ہے۔"

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اُٹھی۔ میرا رنگ پیلا پڑ گیا۔ یہ درد بہت پرانا ہے جس کے دورے مجھے اکثر پڑتے رہتے ہیں۔ میں اس کے دفیعے کے لئے سینکڑوں علاج کر چکا ہوں مگر لاحاصل۔ چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اُٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا۔ عبدالرحمٰن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز

معلوم ہوتی ہے۔"

میں اُس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اِس موذی مرض کا شکار ہوتے نہ دیکھ سکتا، چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہا۔ "کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"جی نہیں، آپ کی طبیعت ناساز ہے —" وہ سخت گھبرا گیا۔ "میں...... میں...... میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ مطلق فکر نہ کریں — سینے میں معمولی سا درد ہے، ابھی ٹھیک ہو جائیگا۔"

"سینے میں درد ہے......" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ "سینے میں درد ہے تو...... تو اِس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو قبض ہے اور قبض......"

قریب تھا کہ میں بھنا کر اُس کو دو تین گالیاں سُنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ "آپ...... حد کرتے ہیں۔ آپ...... سینے کے درد سے قبض کو کیا تعلق؟"

"جی نہیں — قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہے — آپکی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپکو پُرانا قبض ہے اور جناب قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو، جی نہیں، آپ جس کو بافراغت اجابت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو...... سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے...... میرا خیال ہے کہ آپ...... دراصل آپکی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے۔"

عبدالرحمٰن چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہوگیا۔ لیکن فوراً ہی اُس نے اپنے لہجہ میں زیادہ چکناہٹ پیدا کرکے کہا۔"آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہوگا ــــــ ایک معمولی سا علاج میرا بھی کر دیکھئے ــــــ خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دُور ہو جائیگا۔"

میں نے پوچھا۔"کونسا مرض ؟"

عبدالرحمٰن نے زور زور سے ہاتھ ملے "یہی ..... یہی، قبض !"

لاحول ولا، اِس بیوقوف سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے قبض ہے، صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پُرانا ہے اور سب ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے۔ مگر یہ نیم حکیم خطرۂ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے، قبض ہے، قبض ہے، کہیں ایسا نہ ہو میں اس کے سر پر غصّے میں آکر چائے کا پیالہ دے ماروں۔ عجیب نامعقول آدمی ہے، اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور کسی کی سُنتا ہی نہیں۔

غصّے کے باعث میں بالکل خاموش ہوگیا۔ اس خاموشی کا عبدالرحمٰن نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا۔ خدا معلوم اُس نے کیا کیا کچھ کہا: .....

"بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپکے سُدّے پڑ گئے ہیں۔ آپ کو روز اجابت تو ہو جاتی ہے مگر یہ سُدّے باہر نہیں نکلتے۔ معدے کا فعل چونکہ دُرست نہیں رہا اس لئے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہوگئی ہے۔ رطوبت یعنی وہ لیسدار مادہ جو فضلے کو نیچے پھسلنے میں مدد دیتا ہے آپ کے اندر بہت کم ہوگیا ہے۔ اِس لئے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپکو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہوگا۔ قبض کھولنے کے لئے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوائیں

بازار میں بکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں اِس لیے کہ اُن سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمایئے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لیے آپ کو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے ...... یونانی دوائیں اول تو ہم لوگوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہیں۔ دوسرے ....

میں نے تنگ آکر اُس سے کہا: "آپ چائے پئیں گے؟" اور اُس کا جواب سُنے بغیر ہوٹل والے کو آرڈر دیا "گلاب، اِن کے لیے ایک ڈبل چائے لاؤ۔"

چائے فوراً ہی آگئی، عبدالرحمٰن کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا "معاف کیجئے گا، مجھے ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ ایک سین کے متعلق بات چیت کرنا ہے ـــــ پھر کبھی گفتگو ہوگی۔"

یہ سب کچھ اِس قدر جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبدالرحمٰن کی زبان پر منجمد ہوگئی اور میں رسٹوران سے باہر نکل گیا۔ درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہوگئی تھی، اُس کی باتوں نے اِس تکدّر میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیوں اِس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے۔ میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ میں مدقوق ہوں جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہتے آئے ہیں! وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے سِل ہے میری انتڑیوں میں ورم ہے، میرے معدے میں رسولی ہے، میرے دانت خراب ہیں۔ مجھے گٹھیا ہے مگر بار بار اُس کا اِس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا تھا کہ مجھے قبض ہو رہا ہے۔ یعنی اگر مجھے واقعی قبض تھا تو اس کا احساس مجھے پہلے ہونا چاہیئے تھا نہ کہ حافظ عبدالرحمٰن کو ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈائرکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھے ہیرو،

ولن اور تین چار ایکسٹراؤں کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے۔ آوٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کردی گئی تھی۔ اِس لئے سب کو چھٹی تھی۔ مجھے جب ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گذر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمٰن کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ایک ایکسٹرا نے اُس کے خلاف کافی زہر اُگلا۔ دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اُڑایا۔ تیسرے نے اس کے مکالمہ ادا کرنے کی نقل اُتاری۔ ہیرو کو حافظ عبدالرحمٰن کے خلاف یہ شکایت تھی۔ کہ وہ اُس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے۔ وِلن نے ڈائرکٹر صاحب سے کہا۔ "بڑا واہیات آدمی ہے صاحب، کل ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایکٹنگ بالکل فضول ہے۔ آپ اُس کو ایک بار ذرا ڈانٹ بتا دیجئے۔"

ڈائرکٹر صاحب مُسکرا کر کہنے لگے "تم سب کو اُس کے خلاف شکایت ہے مگر اُسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے۔"

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

ڈائرکٹر صاحب نے پہلی مُسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا "وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں اُس کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض وبض نہیں ہے لیکن وہ مانتا ہی نہیں، ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے۔ کئی علاج بھی مجھے بتا چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور پھر اُس کا علاج بتانے سے —— وہ مجھے ممنون ہی تو کرنا چاہتا ہے ورنہ پھر اسکا کیا مطلب ہو سکتا ہے —— بات

دراصل یہ ہے کہ اُسے صرف اِسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں جن سے قبض دُور ہو سکتا ہے چونکہ مجھے وہ خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اِس لئے ہر وقت اِس تاک میں رہتا ہے کہ جونہی مجھے قبض ہو وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر دے ــــ آدمی دلچسپ ہے"

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا

"ڈائرکٹر صاحب ـــــ آپ کے علاوہ حافظ صاحب کی نظرِ عنایت خاکسار پر بھی ہے ـــــ میں نے کل اُن کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے۔ اِس احسان کا بدلہ اُتارنے کے لئے ابھی ابھی ہوٹل میں اُنھوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے...... خدا کا شکر ہے کہ میں اُن کے اِس حملے سے بچ گیا اِس لئے کہ مجھے قبض نہیں ہے"

اِس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہو گیا، یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اِس کو پورے دو مہینے ہو گئے ہیں میں کئی پیٹنٹ دوائیں استعمال کر چکا ہوں۔ مگر ابھی تک اِس سے نجات حاصل نہیں ہوئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ حافظ عبدالرحمٰن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقع دے ہی دوں۔ کیا حرج ہے؟ ـــــ مجھے اُس سے محبّت تو ہے نہیں ؛

ایکٹریس کی آنکھ

"پاپوں کی گٹھڑی" کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی، رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کیلئے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹریس سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لئے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ ان پیالیوں پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سُن کر کسی نو وارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔

دراز قد ولن جو شکل و صورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا، ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا۔ آنکھیں کھُلی تھیں اور مُنہ بھی نیم وا تھا۔ مگر وہ سو رہا تھا۔ اِسی طرح اُس کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک مونچھوں والا ادھیڑ عُمر کا ایکٹر اُونگھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کمپنی کے مکالمہ نویس یعنی منشی صاحب ہونٹوں میں بیڑی دبائے اور ٹانگیں، میک اپ ٹیبل پر رکھے، شاید وہ گیت

بنانے میں مصروف تھے جو اُنہیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا۔

"اُوئی، اُوئی، اُوئی...... ہائے"

دفعتاً یہ آواز باہر سے اِس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوئی۔ وِلن صاحب جھٹ سے اُٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے۔ مونچھوں والے ایکٹر کے لمبے لمبے کان ایک ارتعاش کے ساتھ اِس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لئے تیار ہوئے۔ منشی صاحب نے میک اپ ٹیبل پر سے اپنی ٹانگیں اٹھالیں اور ولن صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

"اُوئی، اُوئی، اُوئی — ہائے...... ہائے!"

اس پر، وِلن، منشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے۔ سب نے کاٹھ کے اُس بکس نما کمرے سے اپنی گردنیں باہر نکالیں۔

"ارے، کیا ہے بھئی"

"خیر تو ہے!"

"کیا ہوا؟"

"اماں، یہ تو — دیوی ہیں!"

"کیا بات ہے! دیوی؟"

جتنے مُنہ اتنی باتیں — کھڑکی میں سے نکلی ہوئی ہر گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہوئی اور ہر ایک کے مُنہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور استفسار کے مِلے جُلے جذبات کا اظہار ہوا۔

"ہائے، ہائے، ہائے — اُوئی — اُوئی!"

— دیوی، کمپنی کی ہر دلعزیز ہیروئن کے چھوٹے سے مُنہ سے چیخیں نکلیں

اور باہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اُس نے اپنے چپّل پہنے پاؤں کو زور زور سے اسٹڈیو کی پتھریلی زمین پر مارتے ہوئے چیخنا چلاّنا شروع کر دیا۔

ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھلتی ہوئی گندمی رنگت خوب خوب کالی کالی تیکھی بھنویں، کھلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکا ــــ بال کالے بھونرا سے جو سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دیکر کنگھی کئے ہوئے تھے، ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے شہد کی بہت سی مکھیاں چھتے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔

کنارے دار سفید سوتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، چولی گجراتی تراش کی تھی، بغیر آستینوں کے، جن میں سے جوبن پھٹا پڑتا تھا، ساڑھی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا۔ ــــ گول گول کلائیاں جن میں کھُلی کھُلی جاپانی ریشمین چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ اِن ریشمین چوڑیوں میں ملی ہوئی اِدھر اُدھر ولایتی سونے کی پتلی پتلی کنگنیاں چھم چھم کر رہی تھیں۔ کان موزوں اور لویں بڑی خوبصورتی کے ساتھ نیچے جھکی ہوئیں، جن میں ہیرے کے آویزے، شبنم کی دو تھرائی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔

چیختی چلاّتی، اور زمین کو چپّل پہنے پیروں سے کوٹتی، دیوی نے داہنی آنکھ کو ننھے سے سفید رومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

”ہائے، میری آنکھ ــــ ہائے میری آنکھ ــــ ہائے!“

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں پھر سے ہلنے لگیں۔

”آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے؟“

"یہاں کنکر بھی تو بیشمار ہیں ـــــ ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔"

"یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے۔"

"اندر آجاؤ، دیوی۔"

"ہاں، ہاں، آؤ ـــــ آنکھ کو اِس طرح نہ ملو۔"

"ارے بابا ـــــ بولا نہ تکلیف ہو جائیگی ـــــ تم اندر تو آؤ۔"

آنکھ ملتی ملتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی۔

دلّن نے لپک کر تپائی پر سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں اور اپنی پرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر جما دیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پھینک کر جیب سے ایک سگرٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی۔ صوفے پر سے منشی صاحب اور دلّن اُٹھ کھڑے ہوئے منشی صاحب نے بڑھ کر کہا۔ "آؤ، دیوی یہاں بیٹھو۔"

دروازے کے پاس بڑی بڑی سیاہ و سفید مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے، اُن کی مونچھوں کے لٹکے اور بڑھے ہوئے بال تھرتھرائے اور اُنھوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجہ میں کہا:۔ "ادھر بیسو۔"

دیوی اُن کی تھرتھراتی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دئیے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی۔ ایک نوجوان سے جو ہیرو سے معلوم ہو رہے تھے اور بنیان قمیص پہنے ہوئے تھے، جھٹ سے ایک چوکی نما کرسی سرکا کر آگے بڑھا دی اور دیوی نے اُس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔

سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ منشی صاحب کی قوتِ احساس چونکہ دوسرے مردوں سے زیادہ تھی، اس لئے چشمہ ہٹا کر اُنھوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع کر دی تھی۔

جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی، اُس نے جُھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے مفکرانہ انداز میں کہا: "آنکھ کی سُرخی بتا رہی ہے کہ تکلیف ضرور ہے۔"

اُن کا لہجہ پھٹا ہوا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اُٹھا۔

یہ کہنا تھا کہ دیوی نے اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اُس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔

وکیل صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جُھکا کر دیوی سے پوچھا۔ "جلن محسوس ہوتی ہے یا چبھن!"

ایک اور صاحب جو اپنے سولا ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے، آگے بڑھ کے پوچھنے لگے۔ "پپوٹوں کے نیچے رگڑ سی تو محسوس نہیں ہوتی۔"

دیوی کی آنکھ سُرخ ہو رہی تھی۔ پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث مَیلے مَیلے نظر آ رہے تھے۔ چِتونوں میں سے لال لال ڈوروں کی جھلک چِک میں سے غروبِ آفتاب کا سُرخ سُرخ منظر پیش کر رہی تھی۔ داہنی آنکھ کی پلکیں نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں، جس سے اُن کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دُکھتی آنکھ کی پُتلی نچاتے ہوئے کہا:-

"آں..... بڑا تکلیف ہوتی ہے..... ہائے........ اُوئی!" اور پھر سے آنکھ

کو گیلے رومال سے ملنا شروع کر دیا۔

سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے، بلند آواز میں کہا "اس طرح آنکھ نہ رگڑو، خالی بیلی کوئی اور تکلیف ہو جائیگا۔"

"ہاں، ہاں...... ارے، تم پھر وہی کر رہی ہو!" پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا۔

ولن جو فوراً ہی دیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت میں دیکھنا چاہتے تھے، بگڑ کر بولے "تم سب بیکار باتیں بنا رہے ہو...... کسی سے ابھی تک یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے...... اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے......" یہ کہکر اُنہوں نے مڑ کر کھڑکی میں سے باہر گردن نکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ "ارے..... کوئی ہے..... کوئی ہے؟ گلاب؟ — گلاب!"

جب اُن کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تو اُنہوں نے گردن اندر کو کرلی اور بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھوکرا کہاں غائب ہو جاتا ہے...... پڑا اونگھ رہا ہوگا اسٹڈیو میں کسی تختے پر — مردود، نابکار!" پھر فوراً ہی دُور اسٹڈیو کے اُس طرف گلاب کو دیکھ کر چلائے، جو انگلیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے چلا آ رہا تھا۔ "ارے گلاب — گلاب!"

گلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہونچ کر ٹھہر گیا۔ ولن صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں اُس سے کہا "دیکھو! ایک گلاس میں پانی لاؤ..... جلدی سے...... بھاگو!"

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا، دیکھنے کے لئے کہ یہ گڑبڑ کیا ہے۔ — اِس پر ہیرو صاحب للکارے "ارے دیکھتا کیا ہے — لا، نا گلاس میں تھوڑا سا پانی — بھاگ کے جا، بھاگ کے!"

گلاب سامنے، ٹین کی چھت والے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیوی کی آنکھ میں چبھن اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور اُس کی بنارسی لنگڑے کی کیری ایسی ننھی منی ٹھوڑی روتے بچّے کی طرح کانپنے لگی اور وہ اُٹھ کر درد کی شدّت سے کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ دستی بٹوے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اُس نے اپنی دُکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اتنے میں منشی صاحب بولے "گلاب سے کہہ دیا ہوتا ــــ پانی میں تھوڑی سی برف بھی ڈالتا لائے!"

"ہاں، ہاں، سرد پانی اچھا رہے گا!" یہ کہہ کر ولن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلاّئے "گلاب ــ ارے گلاب ــ پانی میں تھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا!"

اِس دَوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے، کہنے لگے "مَیں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھانپ سے گرم کرو اور اُس سے آنکھ کو سینک دو ــــ کیوں دادا؟"

"ایکدم ٹھیک رہے گا!" سیاہ وسفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اثبات میں بڑے زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے ــ اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اُس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ دیوی نے رومال لے لیا اور اُسے مُنہ کے پاس لے جا کر گال پُھلا پُھلا کر سانس کی گرمی پہنچائی، آنکھ کو ٹکور دی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

"کچھ آرام آیا؟" سولا ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا۔

دیوی نے روتی آواز میں جواب دیا "نہیں... نہیں..... ابھی نہیں نکلا۔
...... میں مر گئی!......"

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ ہیرا اور دلن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے ملکہ دیوی کی آنکھ میں پانی چھوایا۔ جب گلاس کا پانی آنکھ کو غسل دینے میں ختم ہو گیا، تو دیوی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور آنکھ جھپکانے لگی۔

"کچھ افاقہ ہوا"

"اب تکلیف تو نہیں ہے؟"

"کنکری نکل گئی ہوگی"

"بس تھوڑی دیر کے بعد آرام آجائیگا!"

آنکھ دھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کیلئے دیوی کی آنکھ میں چبھن رفع کر دی، مگر فوراً ہی پھر سے اُس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

نووارد کہنہ سال ہونے کے باوجود چست و چالاک معلوم ہوتے تھے۔ مونچھیں سفید تھیں، جو بیڑی کے دھوئیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں۔ اُن کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ فوج میں رہ چکے ہیں

سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اس طرف ترچھی پہنے ہوئے تھے۔ پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا۔ کولہوں اور رانوں کے

اُوپر پتلون میں پڑے ہوئے جھول اِس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ ان کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی میلی نکٹائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، وہ اُن سے روٹھی ہوئی ہے۔ پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر سے کھچ کر آگے بڑھا ہوا تھا، جو یہ بتا رہا تھا کہ وہ اِس بیجان چیز سے بہت کڑا کام لیتے رہے ہیں۔ گال بڑھاپے کے باعث پچکے ہوئے آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، جو بار بار شانوں کی عجیب جُنبش کے ساتھ سُکیڑ لی جاتی تھیں۔

آپ نے کاندھوں کو جُنبش دی اور ایک قدم آگے بڑھ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا "کنکر پڑ گیا ہے کیا؟" اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے۔ ہیرو اور ولّن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرکے آپ نے کہا "پانی سے آرام نہیں آیا — خیر — رومال ہے کسی کے پاس؟"

نصف درجن رومال اُن کے ہاتھ میں دیدیئے گئے۔ بڑے ڈرامائی انداز میں آپ نے ان پیش کردہ رومالوں میں سے ایک مُنتخب کیا، اور اُس کا ایک کنارا پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ ہٹا لینے کا حُکم دیا۔

جب دیوی نے اُن کے حکم کی تعمیل کی، تو اُنھوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چرمی بٹوا نکالا اور اُس میں سے اپنا چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھا لیا۔ پھر چشمے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھ کا دُور ہی سے اکڑ کر معائنہ کیا۔ پھر دفعتاً فوٹو گرافر کی سی پُھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں چوڑی کیں اور جب اُنھوں نے اپنی پتلی پتلی اُنگلیوں سے دیوی کے پپوٹوں کو وا کرنا چاہا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ فوٹو لیتے وقت کیمرے کا لینس بند کر رہے ہیں۔

دو تین مرتبہ ڈرامائی انداز سے اپنے کھڑے ہونے کا رُخ بدل کر اُنہوں نے دیوی کی آنکھ کا معائنہ کیا اور پھر پپوٹے کھول کر بڑی آہستگی سے رومال کا کنارہ اُن کے اندر داخل کر دیا ــــ حاضرین خاموشی سے اس عمل کو دیکھتے رہے۔

پانچ منٹ تک کمرے میں قبر کی سی خاموشی طاری رہی۔ آنکھ صاف کرنے کے بعد اُسی ڈرامائی انداز میں فوٹو گرافر صاحب نے...... چونکہ وہ بزرگ فوٹو گرافر ہی تھے...... چشمہ اُتار کر چرمی بٹوے میں رکھکر دیوی سے کہا۔ ”اب کنکر نکل گیا ہے ــــ تھوڑی دیر میں آرام آجائیگا!“

دیوی نے اُنگلیوں سے آنکھ کے پپوٹوں کو چھوا اور ننھا سا آئینہ نکال کر اپنا اطمینان کرنے لگی۔

”کنکری نکل گئی نا؟“

”اب درد محسوس تو نہیں ہوتا!“

”سالا، اب نکل گیا ہوگا ــــ بہت دُکھ دیا ہے اس نے!“

”دیوی...... اب طبیعت کیسی ہے؟“

یہ شور سُن کر فوٹو گرافر صاحب نے کاندھوں کو زور سے جنبش دی اور کہا۔ ”تم سارا دن کوشش کرتے رہتے مگر کچھ نہ ہوتا...... ہم فوج میں پچیس برس بھاڑ نہیں جھونکتا رہا...... یہ سب کام جانتا ہے...... کنکر نکل گیا ہے۔ اب صرف جلن باقی ہے، وہ بھی دُور ہو جائے گی۔“

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں رونی صورت بنائے اپنا اطمینان کر رہی تھی، ایکا ایکی مُسکرائی اور پھر کھل کھلا کر ہنس دی ــــ چوبی کمرے میں مترنم تارے بکھر گئے۔

”اب آرام ہے...... اب آرام ہے!“ یہ کہہ کر دیوی، سیٹھ کی جانب

روانہ ہو گئی، جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا، اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔

ہیرو جب صوفے پر بیٹھنے لگا تو منشی صاحب کی ران نیچے دب گئی۔ آپ بھنا گئے۔ "اب کیا پھر سونے کا ارادہ ہے — چلو بیٹھو، مجھے کل والے سین کے ڈائلاگ سناؤ۔"

ہیرو کے دماغ میں اس وقت کوئی اور ہی سین تھا۔

٭٭٭٭٭

وہ خط جو پوسٹ نہ کئے گئے

حوّا کی ایک بیٹی کے چند خطوط جو اُس نے فرصت کے وقت محلے کے چند لوگوں کو لکھے۔ مگر اُن وجوہ کی بنا پر پوسٹ نہ کئے گئے۔ جو اِن خطوط میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

(نام اور مقام فرضی ہیں)

پہلا خط مسز کرپلانی کے نام:-

خاتون مکرّم

آداب عرض۔ معاف فرمائیے گا۔ میں یہ سطور بغیر تعارف کے لکھ رہی ہوں۔ مگر مجھے چند ضروری باتیں آپ سے کہنا ہیں۔ آپ کو میں ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ہر روز صبح ساڑھے آٹھ بجے جب میں بستر سے اُٹھ کر بالکنی میں آتی ہوں۔ تو آپ کو بازار میں سیر سے واپس آتے دیکھا کرتی ہوں۔ مجھے تعجب ہے۔ کہ مسٹر کرپلانی جنہیں ساڑھے آٹھ بجے گھر سے دفتر پہنچنے کے لئے نکل جانا ہوتا ہے۔ صرف ایک بڈھی نوکرانی کی موجودگی اور آپ کی غیر حاضری میں ناشتہ کیسے کرتے ہیں، کپڑے کیوں کر تبدیل کرتے ہیں۔ اور پھر آپ کا بچّہ بھی تو ہے۔ اُس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں۔ کہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ مگر اس سیر کا اثر آپ کے شوہر پر کیا پڑے گا۔ کیا آپ نے اس کی بابت کبھی غور کیا ہے؟ — میں نے پرسوں مسٹر کرپلانی کو دیکھا۔ اُن کی حالت قابلِ رحم تھی۔ آپ نے سر پر ہیٹ اُلٹا لگا رکھا تھا۔ اور اگر میری نگاہوں نے دھوکا نہیں دیا تو اُن کے بوٹ کا ایک تسمہ کھلا ہوا تھا۔ جو بار بار اُن کے پاؤں میں اُلجھ رہا تھا۔ کل بھی آپ کی حالت ایسی ہی تھی۔ اُن کی پتلون شکنوں سے بھرپور تھی اور ٹائی کی گرہ بھی دُرست نہیں تھی۔

اگر آپ کی صبح کی سیر اسی طرح جاری رہی۔ تو مجھے اندیشہ ہے۔ ایک روز مسٹر کرپلانی اس افراتفری میں دفتر کا رُخ کریں گے۔ کہ راہ چلتی عورتوں کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں گی۔

اور ہاں، دیکھئے، کل آپ نے جو ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ آپ کی نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ مسز اڈوانی نے یہ ساڑھی پچھلی دیوالی پر خریدی تھی۔ دوسروں کے کپڑے پہننا بہت معیوب ہے۔ آپکے پاس کم از کم بیس ساڑیاں موجود ہیں۔ مسز اڈوانی کی ساڑھی مُستعار لے کر آپ نے کیوں پہنی۔ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔

ایک بات اور۔ وہ یہ کہ آپ کو بغیر آستینوں کا بلاؤز اچھا معلوم نہیں ہوتا آپ کے کاندھوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت ہے۔ جس کی نمائش آنکھوں پر بہت گراں گزرتی ہے۔ آپکے جسم کا یہ عیب آستینوں والے بلاوز میں چھپ جاتا ہے۔ اسلئے آپکو ہمیشہ اسی تراش کا بلاؤز پہننا چاہیئے۔

اُونچی ایڑی کا شُو آپ کیوں پہنتی ہیں؟ — آپکا قد ماشاءاللہ کافی اونچا ہے۔ پرسوں آپ نے غیر معمولی اُونچی ایڑی کا سینڈل پہن رکھا تھا۔

معاف فرمائیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے پیروں کے ساتھ اسٹول بندھے ہوئے ہیں۔ اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر آپ آسانی سے چل بھی نہیں سکتیں۔ خواہ مخواہ کیوں اپنے آپ کو تکلیف دیتی ہیں۔

آپ کی ....

دوسرا خط مسز اڈوانی کے نام:۔

محترم بہن۔

تسلیمات۔ میں نے پچھلے دنوں آپ کو باندرہ کے میلے پر چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ آپ نے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ بورڈر کے بغیر۔ بلاؤز کالی ساٹن کا تھا، کھلے گلے کا، آستینوں کے بغیر۔ گلے پر زرد رنگ کی ساٹن کا پائپنگ تھا۔ اور سامنے سینے پر اسی رنگ کا پھول۔ پاؤں میں آپ کے سنہری سینڈل تھی۔ چھاتا سیاہ رنگ کا تھا جس کی مونٹھ زرد رنگ کے سلولائیڈ کی تھی۔ کالے بالوں میں پیلا ربن تھا۔ سیاہی اور زردی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپ کے ذوق کی میں بے حد معترف ہوں۔ رنگوں کے صحیح التزام کا آپ خوب سلیقہ رکھتی ہیں۔ مگر کل آپ جب بس پر سے اتریں تو مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ نے کالی ساڑھی کے ساتھ بھوسلے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا ہے۔ آپ کے بالوں میں نیلا ربن گندھا ہے۔ اور جوتا سفید کینوس کا پہن رکھا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی اعلیٰ ذوق رکھنے والی خاتون نے کیوں کر ایسے بھونڈے لباس میں باہر نکلنا گوارا کیا۔ اور پھر غضب یہ ہے کہ آپ بس میں کہیں دور گئی تھیں۔ آئندہ اگر میں نے آپ کو ایسے بے تکے لباس

میں دیکھا تو مجھے اتنا صدمہ ہوگا۔ کہ میں بیان نہیں کر سکوں گی۔

ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کی نوکرانی اتنا سنگھار کیوں کرتی ہے؟ اُس کی عمر میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ برس ہے۔ بظاہر وہ کنواری ہے۔ اس عمر میں اور خاص کر کنوارپتے میں اُس کا یوں بن سنور کر سودا سلف لینے باہر بازار سے نکلنا اُتنا خطرناک نہیں۔ جتنا کہ اس کا آپکے گھر میں اپنے سنگھار پر توجہ دینا ہے۔ آپ عموماً گھر سے باہر رہتی ہیں۔ اور مسٹر اڈوانی چونکہ دفتر نہیں جاتے۔ اسلیئے وہ اکثر گھر ہی میں رہتے ہیں...... آپکی غفلت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

میرا خیال ہے۔ کہ آپ کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے..... اگر آپ چشمہ پہنا کریں تو یہ عیب بالکل دُور ہو جائے گا۔ کیونکہ شیشوں میں سے یہ معمولی فرق نظر نہ آئے گا۔

ہاں، یہ آپ اپنی سہیلیوں کو اپنی ساڑھیاں پہننے کے لئے کیوں دے دیا کرتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ یہ بدعت معاشرتی نقطۂ نظر سے بہت بُری ہے۔ اس کے علاوہ سہیلیاں خواہ کتنی ہی محتاط ہوں مستعار کپڑے کو نہایت بے دردی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو۔ تو اُس سفید ساڑھی کو غور سے دیکھیئے جو آپ نے ایک روز مسز کرپلانی کو پہننے کے لئے دی تھی۔ اِس کا تِلّے کا کام کئی جگہ سے اُکھڑ گیا ہے۔

بازار میں چلتے وقت آپ بار بار ساڑھی کا پلّو نہ سنبھالا کریں۔ مجھے اس سے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔

آپ کی......

تیسرا خط مسٹر ایوب خاں انسپکٹر پولیس کے نام۔

مکرمی محترمی۔ سلام مسنون۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ آپ دن میں دو بار اپنی ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیں ــــ میں سمجھتی ہوں کہ نارمل آدمی کی ڈاڑھی کے بال نارمل حالت میں اتنی جلدی کبھی نہیں اُگتے۔ پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے اور وہاں سے شام کو آتے ہوئے آپ کا پہلا کام یہ ہوتا ہے۔ کہ سیلون میں داخل ہو جائیں ــــ میرا خیال ہے کہ آپ کو MANIA ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا دماغی توازن درست ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دن میں دو بار صبح و شام اپنی ڈاڑھی پر اُسترا پھرائیں.... کیا سیلون کا نائی آپ کی اس عجیب و غریب عادت پر زیرِ لب کبھی نہیں مُسکرایا؟

اور پھر یہ آپ اپنے سر کے بال کس طور سے کٹواتے ہیں؟ ــــ واللہ بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ گردن سے لے کر کھوپڑی کے بالائی حصّے تک آپ بالوں کا بالکل صفایا کرا دیتے ہیں۔ اور کانوں کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن بہت بھدّی ہے۔ اور آپکے سر کے نچلے حصّے پر پھوڑوں کے نشان ہیں جو صرف بال ہی چھُپا سکتے ہیں۔ اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ بار بار بال مونڈنے سے آپ کی گردن موٹی ہو جائے گی۔

آپ کے کان بہت بڑے ہیں جس فیشن کی حجامت کا آپ کو شوق ہے۔ اُس سے یہ اور بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ قلمیں رکھیں۔ اور کانوں کے قریب سے بال زیادہ نہ کٹوائیں۔ گردن پر اگر آپ تھوڑے سے بال اُگنے دیں تو کوئی ہرج نہیں۔ اِس سے آپکو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

ہاتھ میں چھڑی لے کر جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو دماغ میں اِس خیال کو جگہ نہ دیا کریں کہ ہر اسکول جانے والی لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے۔ کسی شائستہ مذاق لڑکی کی آنکھیں آپ کی طرف نہیں اُٹھ سکتیں۔ اس لئے کہ آپ اپنے کاندھوں پر ایسا بھونڈا سر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ جس کو آپ کے ایجاد کردہ فیشن نے اور بھی زیادہ بدنما بنا رکھا ہے۔

بار بار آپ اپنے کوٹ سے کیا جھاڑا کرتے ہیں؟ کیا گرد و غبار کے ذرّے صرف آپ ہی کے کوٹ پر آ بیٹھتے ہیں............ یا پھر آپ حد سے زیادہ نفاست پسند ہیں؟

کسی نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ چالیس برس کے ہونے پر بھی آپ کنوارے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔ میرا مشورہ لیجئے۔ اور دن میں دو بار سیلون میں جاکر ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیجئے۔ خدا آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپکی مخلص.........

چوتھا خط مس ڈی سِلوا کے نام۔

ڈیئر مس ڈی سِلوا۔

تمہاری حالت پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ تم روز بروز موٹی ہو رہی ہو۔ اگر تمہارا موٹاپا اسی رفتار سے بڑھتا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تم کسی مرد کے قابل نہ رہو گی۔ اسکول جانے کے لئے جب تم "جم" پہن کر گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اب کرسمس پر تم ڈانس کیسے کر سکو گی۔ ایک دو قدموں ہی میں تمہارا پسینہ چھوٹ

جائے گا۔ اور تمہارا ساتھی کیوں کر تمہاری باہنوں کو حسبِ منشا حرکت میں لا سکے گا۔ تمہاری بغلوں کے نیچے اس قدر گوشت جمع ہو رہا ہے۔ کہ تم ڈانس کرنے کے بالکل قابل نہیں رہی ہو۔ خدا کے لئے اپنا علاج کرو اور اس موٹاپے کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرو۔

ایک نصیحت میری اور سُن لو۔ شام کو تم ہر روز ٹیرس پر اکیلی جاتی ہو۔ اور سامنے والے مکان پر ڈی کوسٹا کے بڑے لڑکے کو اشارے کرتی رہتی ہو۔ اوّل تو یہ شریف لڑکیوں کا کام نہیں۔ دوسرے یہ اشارے چربی بھرے گوشت کے مانند بھدّے اور بے لذت ہوتے ہیں۔ تم جیسی موٹی لڑکیوں کو ایسی اشارہ بازی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ اشارہ ایک لطیف یعنی باریک اور پتلی چیز کا نام ہے۔ تمہارے اشارے، اشارے نہیں ہوتے۔ اُن کے لئے مجھے کوئی اور نام تلاش کرنا ہو گا۔

جس لونڈے کے ساتھ تم رومان لڑانا چاہتی ہو۔ اُسکے متعلق بھی سُن لو۔ وہ ایک آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ ڈھائی مہینے سے کالی کھانسی میں مُبتلا ہے۔ ماں باپ نے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر اُسکو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اُس کے پاس صرف تین پتلونیں ہیں۔ جن کو بدل بدل کر پہنتا ہے۔ ہر روز اپنی قمیص اور پتلون پر وہ دو بار استری کرتا ہے۔ تاکہ باہر کے لوگوں کی نظر میں اُس کی وضع داری قائم رہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے نفرت ہے۔

تم اپنی پنڈلیوں کے بال اُسترے سے نہ مونڈا کرو۔ بال اُڑانے کے سب پوڈر اور سب کریمیں بھی فضول ہیں۔ بال ہمیشہ کے لئے کبھی غائب نہیں ہو سکتے اس لئے تم اپنی پنڈلیوں پر ظلم نہ کرو۔ بال رہنے دو۔ اور لمبی جرابیں پہنا کرو۔

تمہارا دوست آج دوپہر کو اپنا پھٹا ہوا جُوتا خود مرمت

کر رہا تھا۔

تمہاری خیر خواہ........

پانچواں خط کوشلیا دیوی کے نام۔

شریمتی کوشلیا دیوی۔ نمسکار۔

اِس میں کوئی شک نہیں۔ اپنے گھر میں ہر شخص کو اختیار ہے۔ کہ وہ آرام دہ سے آرام دہ لباس پہنے۔ اور تکلفات سے آزاد رہے۔ مگر دیوی جی آپ ململ کی باریک دھوتی پہن کر اس آزادی سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ اور پھر یہ دھوتی آپ کچھ اِس "بے تکلفی" سے پہنتی ہیں کہ جب آپ اتفاق سے نظر آجائیں۔ تو سوچنا پڑتا ہے۔ کہ آپ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ روشنی کے سامنے کھڑے ہونے سے آپ کی ململ کی دھوتی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ آپکی عمر اس وقت چوالیس برس کے قریب ہے۔ عمر کی اس زیادتی نے آپکے جسم کو بالکل ڈھیلا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باریک دھوتی میں سے آپکی بھدّی ٹانگوں کی نمائش آنکھوں پر "گو ہانجی" بنکر رہ جاتی ہے۔

آپکے فلیٹ کا دروازہ عام طور پر کُھلا رہتا ہے۔ اور میں نے اکثر آپ کو اورچی خانہ کے پاس یہی باریک دھوتی پہنے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو اس کا استعمال ترک نہیں کرنا ہے تو براہِ کرم اپنے فلیٹ کا دروازہ بند رکھا کریں۔

آپ کی......

چھٹا خط مسٹر سعید حسن جرنلسٹ کے نام۔

جنابِ من۔ تسلیم۔

آپ ہر روز صبح بالکونی میں پتلون پہنتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل کمیونزم کی بدترین مثال ہے۔ مجھے اُمید ہے۔ کہ یہ خط پڑھ کر آپ ضرور شرمسار ہونگے۔ اور آئندہ سے پتلون شریف آدمیوں کی طرح اپنے کمرے میں پہنا کریں گے۔

مخلص
....

مکرر:۔ آپ کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ سیلون آپ کے مکان کے نیچے ہے۔ ہمت کر کے آج ہی کٹوا دیں۔

ساتواں خط مسز قاسمی کے نام۔

خاتونِ مکرّم۔ السلام علیکم:۔

میں بہت عرصے سے آپکو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ مگر چند در چند وجوہ کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ میں نے سُنا ہے کہ دو گھروں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے آپ کو بہت سے گُر زبانی یاد ہیں۔ مسز اڈوانی اور مسز کرپلانی کے درمیان ایک دفعہ آپ ہی کی کوششوں سے رنجش پیدا ہوئی تھی۔ اور پچھلے دنوں سیٹھ گوپال داس کی لڑکی پشپا کے بارے میں آپ نے جو افواہیں مشہور کی تھیں۔ اُن سے سیٹھ گوپال داس اور سیٹھ رام داس کے خاندانوں میں اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں۔ کہ ابھی تک آپ کے اور مسز قانونگو کے درمیان کشیدگی پیدا کیوں نہیں ہوئی۔ اب تک آپ نے جس عورت کو اپنی سہیلی بنایا ہے اُس سے تیسرے چوتھے مہینے آپ کی تو تو میں میں ضرور ہوئی ہے۔ لیکن مسز قانونگو سے آپ کی دوستی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ جو کئی برسوں کے برابر ہیں۔ میں اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتی۔ اس مہینے میں مسز قانونگو سے آپ کی چخ ضرور ہو جانی چاہیئے۔ آپکو

اپنی روایات برقرار رکھنی چاہئیں۔۔۔

ہاں یہ ضرور بتایئے۔ کہ آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ پنجاب کی رہنے والی ہیں۔ مگر آپ کا چہرہ نیپالیوں اور تبتیوں سے کیوں ملتا جلتا ہے؟۔ آپکی ناک بالکل نیپالیوں کی طرح چپٹی ہے۔ اور گالوں کی ہڈیاں بھی اُنہی کی طرح اُبھری ہوئی ہیں، البتہ آپ کا قد اُن کی طرح پست نہیں۔

آپ نے عید پر جو ساڑھی پہنی تھی۔ مجھے پسند نہیں آئی۔ آپ کا ذوق بہت فضول ہے۔ اگر آپ بھڑکیلے اور شوخ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے انتخاب کیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ لمبے قد کی عورتوں کو کھڑی لکیروں کی قمیص نہیں پہننی چاہیئے۔ اس سے وہ اور لمبی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح آپکو "پف سلیوز" کا بلاؤز بھی نہیں پہننا چاہیئے۔ کیونکہ لمبے قد کی عورتوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہوتا۔ اور پھر آپ تو ویسے ہی دُبلی پتلی ہیں۔ آپکے کاندھے پر بلاؤز کے اُٹھے ہوئے "پف" بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

آپکی خیر اندیش ۔۔۔۔۔۔۔

آٹھواں خط مس راجکماری ایکٹرس کے نام

مس راجکماری۔

مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم عورت نہیں ہو۔ سوٹ کیس ہو۔

تم سے نفرت کرنیوالی ۔۔۔۔۔

نواں خط مسٹر صالح بھائی کنٹریکٹر کے نام۔

جناب صالح بھائی صاحب۔ تسلیم۔

مجھے آپکے خلاف کوئی شکایت نہیں لیکن پھر بھی میں آپکو پسند

نہیں کرتی۔ نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ آپکو دیکھ کر میرے دل میں غیض وغضب پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی شکل وصورت بھی کوئی خاص بُری نہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ پھر آپکو میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہوں...... آپ کے چہرے پر یتیمی برستی ہے۔ آپ کی چال بھی نہایت واہیات ہے۔

آپکی ہمدرد......

دسواں خط مس رضیہ صلاح الدین کے نام۔

ڈیئر مس رضیہ۔ سلام مسنون۔

تم ابھی ابھی پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہو۔ پہلے ساڑھی پہننے کی عادت اختیار کرو، پھر اس لباس میں باہر نکلو۔ تمہیں یہ لباس پہننے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ خُدا کے لئے اپنے آپ کو تماشہ نہ بناؤ۔

تمہاری خیر خواہ......

"مِصری کی ڈلی"

پچھلے دنوں میری رُوح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ رُوح اِس لئے کہ میں نے دفعتہً اپنے ماحول کی خوفناک ویرانی کو محسوس کیا تھا اور جسم اِس لئے کہ میرے تمام پٹھے سردی لگ جانے کے باعث چوبی تختے کے مانند اکڑ گئے تھے۔ دس دن تک میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا رہا — پلنگ — اُس چیز کو پلنگ ہی کہہ لیجئے جو لکڑی کے چار بڑے بڑے پائیوں، پندرہ بیس چوبی ڈنڈوں اور ڈیڑھ دو من وزنی مستطیل آہنی چادر پر مشتمل ہے۔ لوہے کی یہ بھاری بھرکم چادر نواڑ اور سُوتلی کا کام دیتی ہے۔ اِس پلنگ کا فائدہ یہ ہے کہ کھٹمل دُور رہتے ہیں اور یوں بھی کافی مضبوط ہے، یعنی صدیوں تک قائم رہ سکتا ہے۔

یہ پلنگ میرے پڑوسی سلیم صاحب کا عنایت کردہ ہے۔ میں زمین پر سوتا تھا چنانچہ اُنہوں نے مجھے یہ پلنگ جو اُنہیں کمرے کے ساتھ ہی ملا تھا مجھے دے دیا تاکہ میں سخت فرش پر سونے کے بجائے لوہے کی چادر پر آرام کروں۔ سلیم صاحب اور اُن کی بیوی کو میرا بہت خیال ہے اور میں اُن کا بہت ممنون ہوں۔ اگر میں معمولی سے معمولی چارپائی بھی بازار سے لیتا تو کم از کم چار پانچ روپے خرچ ہو جاتے۔

خیر، چھوڑیئے اِس قصّے کو۔ میں یہ بات کر رہا تھا کہ پچھلے دنوں میری رُوح

اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ دس دن اور دس راتیں میں نے ایسے خلا میں بسر کیں جس کی تفصیل میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کہیں لٹکا ہوں۔ لوہے کے پلنگ پر لیٹے لیٹے یوں بھی میرا جسم بالکل شل ہو گیا تھا۔ دماغ ویسے ہی منجمد تھا جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں میں کیا عرض کروں، میری کیا حالت تھی۔

دس دن اس ہیبت ناک خلا میں رہنے کے بعد میرے جسم کی علالت دور ہو گئی۔

دس کا عمل تھا۔ دھوپ سامنے کارخانے کی بلند چمنی سے پہلو بچاتی کمرے کے فرش پر لیٹ رہی تھی۔ میں لوہے کے پلنگ پر سے اٹھا۔ تھکے ہوئے جسم میں انگڑائی سے حرکت پیدا کرنے کی کوشش کے بعد جب میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کمرہ وہ نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دائیں ہاتھ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا میز ہمارے کمرے میں ہوا کرتا تھا مگر اس کا پالش اتنا چمکیلا کبھی نہیں تھا اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی اس میں اتنی خوبیاں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں جو بڑا میز پڑا رہتا تھا وہ بھی مجھے نامانوس معلوم ہوا۔ اس کا بالائی ہشت پہلو تختہ چمک رہا تھا۔ دیوار پر پانچ چھ تصویریں آویزاں تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

ان میں سے ایک تصویر پر میری نگاہیں جم گئیں۔ میں بڑھا اور اس کو قریب سے دیکھا۔ جدید فوٹوگرافی کا بہت عمدہ نمونہ تھا۔ ہلکے بھوسلے رنگ کے کاغذ پر ایک جواں سال لڑکی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے اور کانوں پر ادھر ادھر کو اڑ رہے تھے۔ سینہ سامنے سے ناف کے ننھے سے

دباؤ تک ننگا۔ اس نرم و نازک عریانی کو اُس کی گوری باہیں جو اُسکے چہرے تک اٹھی ہوئی تھیں، چھپانے کی دلچسپ کوشش کر رہی تھیں۔ پتلی پتلی لمبے لمبے ناخنوں والی انگلیوں میں سے چہرے کی حیا چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ کہنیوں نے ننھے سے پیٹ کے اختتامی خط پر آپس میں جُڑ کر ایک دل کش تکون بنادی تھی جس میں سے ناف کا گدگدا گڑھا جھانک رہا تھا۔ اگر اس چھوٹے سے گڑھے میں ڈنڈی گاڑ دی جاتی تو اُس کا پیٹ سیب کا بالائی حصّہ بن جاتا۔

میں دیر تک اس نیم عُریاں و نیم مستور شباب کو دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ تصویر کہاں سے آگئی۔ اسی حیرت میں غرق میں غُسل خانے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے چوتھے کونے میں نل کے نیچے فرش میں سل لگی ہوئی ہے اسکے ایک طرف چھوٹی سی مُنڈیر بنادی گئی ہے۔ یہ جگہ جہاں جست کی ایک بالٹی، صابُن دانی، دانتوں کے دو بُرش، ڈاڑھی مونڈنے کے دو اُسترے، صابُن لگانے کی دو کوُچیاں، منجن کی بوتل اور پانچ چھ استعمال شدہ اور زنگ آلود بلیڈ پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا غُسل خانہ ہے۔ نذیر صاحب جن کا یہ کمرہ ہے، علی الصبح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ چنانچہ داڑھی مُونڈکر وہ فوراً ہی غسل سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ میں سویا رہتا ہوں اور وہ مزے سے ننگے نہاتے رہتے ہیں۔

اس غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تمام چیزوں پر نگاہ دوڑائی۔ اب مجھے وہ کسی قدر مانوس معلوم ہوئیں۔ مُنڈیر پر میرا اُسترا اور گھسا ہوا بُرش اسی طرح پڑا تھا جس طرح میں روز دیکھا کرتا تھا۔ بالٹی بھی بلاشک و شبہ وہی تھی جو ہر روز نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ اُنہیں

ڈھنگا بھی وہی تھا جس میں جا بجا گڈھوں میں میل جما رہتا تھا۔

مُنڈیر پر بیٹھ کر جب میں نے بُرش سے دانت گھِسنے شروع کئے تو میں نے سوچا کمرہ وہی ہے جس میں ایک سو بیس راتیں میں گذار چکا ہوں ـــــ راتیں؟ میں نے غور کیا ـــــ معاملہ صاف ہو گیا۔ کمرے اور اُس کی اشیار کے نامانوس ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے اُس میں صرف ایک سو بیس راتیں ہی گذاری تھیں۔ صبح سات یا آٹھ بجے جلدی جلدی کپڑے بدل کر جو میں ایک دفعہ باہر نکل جاتا تو پھر رات کو گیارہ بارہ بجے کے قریب ہی لوٹنا ہوتا تھا۔ اِس صورت میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ مجھے کمرے کی ساخت اور اس میں پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملتا اور پھر نہ کمرہ میرا ہے اور نہ اُس کی کوئی چیز میری ملکیت ہے اور یہ بھی تو سچی بات ہے کہ "بڑے شہر انسانیت کے مرقد و مدفن ہوتے ہیں"۔

میں جس ماحول میں چار مہینے سے زندگی بسر کر رہا ہوں، اِس قدر یکساں اور یک آہنگ ہے کہ طبیعت بارہا اُکتا گئی ہے۔ جی چاہا ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر کسی ویرانے میں چلا جاؤں۔ صبح جلدی جلدی نہانا۔ پھر عجلت میں کپڑے پہنکر دفتر میں کاغذ کالے کرتے رہنا، وہاں سے شام کو فارغ ہو کر ایک اور دفتر میں چھ سات گھنٹے اِسی اُکتا دینے والے کام میں مصروف رہنا اور رات کے گیارہ بارہ بجے اندھیرے ہی میں کپڑے اُتار کر سلیم کے دئے ہوئے آہنی پلنگ پر سونے کی کوشش کرنا ـــــ کیا یہ زندگی ہے؟

زندگی کیا ہے؟ ـــــ یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُونی جُراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اِس جُراب کو اُدھیڑتے رہتے ہیں۔ جب اُدھیڑتے اُدھیڑتے دھاگے کا

دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائیگا۔

جب زندگی کے لمحات کٹتے محسوس ہوں اور حافظے کی تختی پر کچھ نقش چھوڑ جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آدمی زندہ ہے اور اگر مہینوں گذر جائیں اور یہ محسوس تک نہ ہو کہ مہینے گذر گئے ہیں تو اِس کا یہ مطلب ہے کہ انسان کی حسیات مُردہ ہو گئی ہیں۔ زندگی کی کتاب میں اگر اُوپر تلے خالی اوراق ہی شامل ہوتے چلے جائیں تو کتنا دُکھ ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے یا کہ نہیں، اس کی بابت میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن میں تو اِس معاملے میں بہت حساس ہوں۔ زندگی کی یہ خالی کاپی جو ہمارے ہاتھ میں تھمائی گئی ہے، آخر اسی لئے تو ہے کہ اُس کے ہر ورق کو ہم استعمال کریں، اُس پر کچھ لکھیں۔ لیکن افسوس اِس بات کا ہے کہ مجھے کوئی ایسی بات ہی نہیں ملتی جس کے متعلق میں کچھ لکھوں۔ لے دے کے میری اس کاپی میں صرف دو تین ورق ایسے ہیں جن پر میں نقش و نگار بنے دیکھتا ہوں ــــ یہ ورق مجھے کتنے عزیز ہیں۔ اگر آپ ان کو نوچ کر باہر نکال دیں تو میری زندگی ایک بیابان بن جائے گی۔ آپ یقین کیجئے، میری زندگی واقعی چٹیل میدان کی طرح ہے۔ جس میں اُن بیتے ہوئے دنوں کی یاد ایک خوبصورت قبر کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔ چونکہ میں نہیں چاہتا کہ اچھے دنوں کی یہ سُہانی یاد مِٹ جائے اِس لئے میں اِس قبر پر ہر وقت مٹی کا لیپ کرتا رہتا ہوں۔

میرے سامنے دیوار پر ایک پُرانا کلنڈر لٹک رہا ہے جس کے میلے کاغذ پر چیسٹر کے لانبے لانبے درختوں کی تصویر چھپی ہے۔ میں اِسے ایک عرصے سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں۔ اسکے پیچھے، دُور، بہت دُور مجھے اپنی زندگی کے اُس کھوئے ہوئے ٹکڑے کی جھلک نظر آ رہی ہے۔

میں ایک پہاڑی کے دامن میں چیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔ بیگو بڑے بھولے پن سے گھٹنے ٹیک کر اپنا سر میرے قریب لاتی ہے اور کہتی ہے۔" آپ مانتے ہی نہیں ـــــ سچ، میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اب بھی یقین نہ آئیگا۔ یہ لیجئے میرے سر میں سفید بال دیکھ لیجئے۔"

چودہ برس کی دیہاتی فضا میں پلی ہوئی جوان لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ معلوم نہیں وہ کیوں اِس بات پر زور دینا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ مجھ سے یہی بات کہہ چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جوان آدمیوں کو شباب کے دائرے سے نکل کر بڑھاپے کے دائرے میں داخل ہونے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ میرے دل میں بھی اِس قسم کی خواہش کئی بار پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے متعدد بار سوچا ہے کہ میری کنپٹیوں پر اگر سفید سفید بال نمودار ہو جائیں تو چہرے کی متانت اور سنجیدگی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کنپٹیوں پر اگر بال سفید ہو جائیں تو چاندی کے مہین مہین تاروں کی طرح چمکتے ہیں اور دوسرے سیاہ بالوں کے درمیان بہت بھلے دکھائی دیتے ہیں، ممکن ہے بیگو کو یہی چاؤ ہو کہ اُس کے بال سفید ہو جائیں اور وہ اپنی کم عمری کے باوجود بڈھی دکھائی دے۔

میں نے اُس کے خشک مگر نرم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی اور کہا۔" تم کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتیں۔"

اُس نے سر اُٹھا کر مجھ سے پوچھا۔" کیوں؟ ـــــ میں کیوں بوڑھی نہیں ہو سکتی؟"

"اِس لئے کہ تم میں آس پاس کے درختوں، پہاڑوں اور اُن میں بہتے ہوئے

نالوں کی ساری جوانی جذب ہو گئی ہے۔"

وہ قریب سرک آئی اور کہنے لگی۔ "جانے آپ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں ــــــ بھئی میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا ــــــ درختوں اور پہاڑوں کی بھی کبھی جوانی ہوتی ہے۔"

"تمہاری سمجھ میں آئے نہ آئے پر میں نے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے ــــــ پر آپ میرے بالوں میں اِس اِس طرح کرتے رہیں۔" بیگو نے اپنے ہاتھ سے سر کو کھجلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بڑا مزا آتا ہے۔"

"بہت اچھا جناب۔" کہہ کر میں نے انگلیوں سے اُس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کو تو مزا آ ہی رہا تھا اب مجھے خود مزا آنے لگا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اُس کے بال میرے اُلجھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔

دیر تک میں اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا، وہ خاموشی سے سر جھکائے مزا لیتی رہی۔ پھر اُس نے اپنی خمار آلود نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور نیند میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اگر سو گئی تو؟"

"میں جاگتا رہوں گا۔"

نیم خوابیدہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پیدا ہوئی اور وہ زمین پر وہیں میرے سامنے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

بیگو سو رہی تھی مگر اُس کی جوانی جاگ رہی تھی جس طرح سمندر کی پُر سکون سطح کے نیچے گرم لہریں دوڑتی رہتی ہیں، اِسی طرح اُسکے محوِ خواب

جسم کی رگوں میں اُس کی گرم گرم جوانی دوڑ رہی تھی۔ بائیں بازو کو سر کے نیچے رکھے اور ٹانگوں کو اکٹھا کئے وہ سو رہی تھی۔ اُسکا ایک بازو میری جانب سرکا ہوا تھا۔ میں اُس کی پتلی اُنگلیوں کی مخروطی تراش دیکھ رہا تھا کہ اُن میں خفیف سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی جیسے مٹر کی پھلیاں ارتعاش پذیر ہو جائیں۔ یہ ارتعاش اُس کی اُنگلیوں سے شروع ہوا اور اُس کے سارے جسم پر پھیل گیا۔ جس طرح تالاب میں پھینکی ہوئی کنکری اُس کی آبی سطح پر چھوٹا سا بھنور پیدا کرتی ہے اور یہ بھنور دائرے بناتا ہوا پھیلتا جاتا ہے، اُسی طرح وہ کپکپاہٹ اُس کی اُنگلیوں سے شروع ہو کر اُس کے سارے جسم پر پھیل گئی۔ نہ جانے اُس کی جوانی کیسے ارتعاش پیدا کرنے والے خواب دیکھ رہی تھی۔

اُس کے نچلے ہونٹ کے کونوں میں خفیف سی تھرتھراہٹ کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے سینے کے اُبھار میں دل کی دھڑکنیں زندگی پیدا کر رہی تھیں۔ گریبان کے نچلے دو بٹن کھُلے تھے، اس طرح جسم سے تھوڑی سی نقاب اُٹھ گئی تھی اور دو نہایت ہی پیاری قوسیں باہر جھانک رہی تھیں۔ سینے کی ننھی سی وادی میں دونوں طرف کے اُبھار بڑی خوبصورتی سے آپس میں گھُل مِل گئے تھے۔

میری نگاہ اُس کے سینے پر کُرتے کی ایک طرف بنی ہوئی جیب پر رُک گئی۔ اس میں خدا معلوم کیا کیا کچھ بیگو نے ٹھونس رکھا تھا کہ وہ ایک گیند سی بن گئی تھی۔ میرے دل میں دفعتہً یہ معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اُس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ آہستہ سے اُس کی جیب کی تلاشی لینے کا ارادہ جیب میں رہنے گیا تو وہ جاگ پڑی۔ سیدھی لیٹ کر اُس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں۔ لمبی لمبی پلکیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں تھرتھرائیں۔ اُس نے

نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا، پھر اُس کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم نے انگڑائی لی اور کہا: "آپ بڑے وہ ہیں؟"

"کیوں؟ —— میں نے کیا کیا ہے؟"

وہ اُٹھ بیٹھی۔ "ابھی آپ نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں سچ مچ سو گئی اور آپ نے مجھے جگانے تک کی تکلیف نہ کی۔ میں اگر ایسے ہی شام تک سوئی رہتی تو ——؟"

اُس نے آنکھوں کی پتلیاں نچائیں اور دفعتہً کچھ یاد کر کے کہا۔ "ہائے میرے اللہ —— میں اپنی جان ہیر کو بھول ہی گئی۔"

سامنے پہاڑی پر اُگی ہوئی سبز جھاڑیوں کی طرف جب اُس نے دیکھا تو اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی۔ "کتنی اچھی ہے میری ہیر۔"

اُس کو اپنی بھینس کی فکر تھی جو ہمارے سامنے پہاڑی پر گھاس چر رہی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ "تمہاری ہیر تو موجود ہے پر رانجھا کہاں ہے؟"

"رانجھا؟" اُس کے لب مُسکراہٹ کے ساتھ کھلے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی اور پھر کھِل کھِلا کر ہنس پڑی "رانجھا —— رانجھا:" اُس نے یہ لفظ کئی مرتبہ دُہرایا۔ میری ہیر کا رانجھا —— مجھے کیا معلوم نگوڑا کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "تمہاری ہیر کا کوئی نہ کوئی رانجھا تو ضرور ہوگا۔ مجھ سے چھپانا چاہتی ہو تو یہ الگ بات ہے۔"

اِس میں چھُپانے کی بات ہی کیا ہے۔" بیگو نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ "اور اگر کوئی ہے بھی تو ہیر کو معلوم ہوگا —— جائیے اُس سے پوچھ لیجئے۔ پر کان میں کہیئے گا، آہستہ سے کہیئے گا، بتاؤ تو تمہارا رانجھا کہاں ہے؟"

"میں نے پوچھ لیا۔"

"کیا جواب ملا؟"

"بولی، بیگو سے پوچھو، وہی سب کچھ جانتی ہے۔"

"جھوٹ —— جھوٹ۔ اِس کا اوّل جھوٹ، اِس کا آخر جھوٹ"۔ بیگو بچوں کی طرح اچھل اچھل کر کہنے لگی "میری ہیر تو بڑی شرمیلی ہے۔ ایسے سوالوں کا وہ کبھی جواب دے ہی نہیں سکتی —— آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اُس نے تو آپکو غصّے میں یہ کہا تھا، چلو ہٹو، کنواریوں سے ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔"

"یہی کہا تھا اور اِس کا جواب اُس کو یوں ملا تھا، یہ تمہارا اتنا بڑا بچھڑا کہاں سے آگیا ہے۔ کیا آسمان سے ٹپک پڑا تھا۔"

بیگو یہ بچھڑے والی دلیل سُن کر لاجواب ہوگئی، مگر وہ چونکہ لاجواب ہونا نہیں چاہتی تھی اِس لئے اُس نے بیکار چلّانا شروع کر دیا "جی ہاں آسمان ہی سے ٹپکا تھا اور سب چیزیں آسمان ہی سے تو آتی ہیں..... نہیں، میں بھولی —— اِس بچھڑے کو تو میری ہیر نے گود لیا ہے۔ یہ اس کا بچّہ نہیں کسی اور کا ہے —— اب بتائیے آپکے پاس کیا جواب ہے؟"

میں نے ہار مان لی اِس لئے کہ میری نگاہیں پھر اُس کی اُبھری ہوئی جیب پر پڑیں جس میں خدا معلوم کیا کیا کچھ ٹھُسا ہوا تھا۔ "میں ہار گیا —— آپکی ہیر کنواری ہے، دُنیا کی سب بھینسیں اور گائیں کنواریاں۔ میں کنوارا ہوں۔ آپ کنواری ہیں، لیکن یہ بتائیے کہ آپ کی اس کنواری جیب کو کیا ہو گیا ہے؟"

اُس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دیکھی تو دانتوں میں اُنگلی دبا کر میری طرف

ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "آپ کو شرم نہیں آتی .... کیا ہوا ہے میری جیب کو۔ میری چیزیں پڑی ہیں اِس میں۔"

"چیزیں ـــــــ اِس سے تمہارا مطلب؟"

"آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ چیزیں پڑی ہیں میرے کام کی اور کیا میں نے پتھر ڈال رکھے ہیں۔"

"تو جیب میں تمہارے کام کی چیزیں پڑی ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں یہ کام کی چیزیں کیا ہیں؟"

"آپ ہرگز نہیں پوچھ سکتے۔ اور اگر آپ پوچھیں بھی تو میں نہیں بتاؤں گی اِس واسطے کہ آپ نے مجھے اپنے چمڑے کے تھیلے کی چیزیں کب دکھائی ہیں۔ میں اگر آپ سے کہوں بھی تو آپ کبھی نہ دکھائیں گے۔"

"میں ایک ایک چیز دکھانے کے لئے تیار ہوں ـــــــ یہ رہا تھیلا۔" میں نے اپنا چرمی تھیلا اُس کے سامنے رکھ دیا۔ "خود کھول کر دیکھ لو پر یاد رہے مجھے اپنی جیب کی سب چیزیں تمہیں دکھانا پڑیں گی۔"

"پہلے میں اِس تھیلے کی تلاشی تو لے لوں!" یہ کہہ اُس نے میرا تھیلا کھولا اور اُس کی سب چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کیں۔ انگریزی کا ایک ناول، کاغذوں کا پیڈ، دو پنسلیں، ایک ربڑ، دس بارہ لفافے، آٹھ ایک ایک آنے والے اسٹامپ۔ دس بارہ خالی لفافے اور لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ ـــــــ یہ میری "چیزیں" تھیں۔

جب وہ ایک ایک چیز اچھی طرح دیکھ چکی تو میں نے اُس سے کہا۔ "اب اپنی جیب کا منہ ادھر کر دو۔"

اُس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ تھیلے میں تمام چیزیں رکھنے کے بعد

اُس نے مجھ سے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ "اب اپنی جیب دکھایئے۔"

میں نے اپنی جیب کا مُنہ کھول دیا۔ اور اُس نے ہاتھ ڈال کر اُس میں جو کچھ بھی تھا باہر نکال لیا، ایک بٹوہ اور چابیوں کا گُچھا تھا، جس میں چھوٹا سا چاقو بھی شامل تھا۔ یہ چاقو گچھے میں سے نکال کر اُس نے ایک طرف زمین پر رکھدیا اور باقی چیزیں مجھے واپس دے دیں۔ "یہ چاقو میں نے لے لیا ہے۔ کھیرے کاٹنے کے کام آئے گا۔"

"لے لو پر مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو —— میں جب تک تمہاری جیب کی ایک ایک چیز نہ دیکھ لوں چھوڑوں گا نہیں۔"

"اگر میں نہ دکھاؤں تو؟"

"لڑائی ہوجائے گی۔"

"ہوجائے —— میں ڈر تھوڑی جاؤں گی۔" یہ کہکر وہ فوراً ہی اپنے دوپٹے کا تنبو بنا کر اُس میں چھپ گئی اور جیب میں سے کچھ نکالنے لگی۔ اس پر میں نے رُعب دار آواز میں کہا۔ "دیکھو، یہ بات ٹھیک نہیں، تم کچھ چھپا رہی ہو۔"

"آپ مان لیجئے، میں سب کچھ دکھا دوں گی —— اللہ کی قسم سب چیزیں ایک ایک کرکے دکھا دوں گی —— یہ تو میں اپنے من سمجھوتے کے لئے کچھ کر رہی ہوں۔"

میں نے پھر رُعب دار آواز میں کہا۔ "کیا کر رہی ہو۔ میں تمہاری سب چالاکیاں سمجھتا ہوں۔ سیدھے من سے تمام چیزیں دکھا دو ورنہ میں زبردستی سب کچھ دیکھ لوں گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوپٹے سے باہر نکل آئی اور آگے بڑھ کر کہنے لگی۔

"دیکھ لیجئے!"

میں اُس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی والا تھا کہ اُس کے تنے ہوئے سینے کو دیکھ کر رُک گیا ۔۔۔ "تم خود ہی ایک ایک چیز نکال کر مجھے دکھاتی جاؤ ۔۔۔ لو اِتنا لحاظ میں تمہارا کئے دیتا ہوں ۔ یوں تمہاری ایمانداری بھی معلوم ہو جائے گی"۔

"نہیں، آپ خود نکالتے جائیے، بعد میں آپ کہیں گے میں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں"۔

"میں دیکھ جو رہا ہوں ۔ تم نکالتی جاؤ"۔

"جیسے آپکی مرضی"۔ یہ کہہ کر اُس نے آہستہ سے اپنی جیب میں دو اُنگلیاں ڈالیں اور سُرخ رنگ کے ریشمین کپڑے کا ایک ٹکڑا باہر نکالا ۔ اس پر میں نے پُوچھا۔ "کپڑے کا یہ بیکار سا ٹکڑا تم ساتھ ساتھ کیوں لئے پھرتی ہو؟"

"جی آپ کو کیا معلوم یہ بہت بڑھیا کپڑا ہے ۔ میں اِس کا رومال بناؤنگی ۔ جب بن جائے گا تو پھر آپ دیکھیئے گا ۔ جی ہاں"۔ یہ کہہ کر اُس نے کپڑے کا ٹکڑا اپنی جھولی میں رکھدیا ۔ پھر جیب سے کچھ نکالا اور وہ بند مٹھی میرے بہت قریب لا کر کھول دی ۔ سلولائڈ کے تین مستعمل کلپ، ایک چابی، اور سیپ کے دو بٹن اُس کی ہتھیلی پر مجھے نظر آئے ۔

میں نے اُس سے کہا۔ "یہ اب اپنی جھولی میں رکھ لو اور باقی چیزیں جلدی جلدی نکالو"۔

اُس نے جیب میں جلدی جلدی ہاتھ ڈال کر باری باری یہ چیزیں باہر نکالیں ۔ سفید دھاگے کی گولی، اسمیں پھنسی ہوئی زنگ آلود سُوئی، لکڑی کی میلی کُچیلی کنگھی، چھوٹا سا ٹوٹا ہوا آئینہ اور ایک پیسہ ۔

میں نے اُس سے پُوچھا۔ "کوئی اور چیز باقی تو نہیں رہی؟"

"جی نہیں"۔ اُس نے اپنے سر کو جنبش دی، "میں نے سب چیزیں آپکے سامنے

رکھدی ہیں۔ اب کوئی باقی نہیں رہی۔"

"غلط" میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو اور جھوٹ بھی ایسا بولتی ہو جو بالکل کچا ہو۔ ابھی ایک چیز باقی ہے۔" جونہی یہ لفظ میرے مُنہ سے نکلے غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہیں یک لخت اپنے دوپٹے کی طرف مڑیں۔ میں نے تاڑ لیا کہ اُس نے کچھ چھپایا ہوا ہے۔ "بیگو، سیدھے من سے مجھے یہ چیز دکھا دو جو تم نے چھپائی ہے، ورنہ یاد رکھو وہ تنگ کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گی۔ گُدگُدی ایسی چیز ہے کہ ...."

گُدگُدی کے تصوّر ہی نے اُس کے جسم کو اکٹھا کر دیا۔ وہ سُکڑ سی گئی۔ اس پر میں نے ہوا میں اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں نچائیں۔ "یہ اُنگلیاں ایسی گدگدی کر سکتی ہیں کہ جناب کو پہروں ہوش نہ آئے گا۔"

وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھولکر نیچے پھینک دیا ہے۔ "نہیں، نہیں —— خُدا کے لئے کہیں ایسا کر بھی نہ دیجئے گا۔ —— میں مر جاؤں گی۔"

جب میں سچ مچ اپنے ہاتھ اُس کے کندھوں تک لے گیا تو وہ بے تحاشا، چیختی ہنستی اور سمٹتی سمٹاتی اُٹھی اور بھاگ گئی —— دوپٹے میں سے کوئی چیز گری جو میں نے دوڑ کر اُٹھا لی —— مصری کی ایک ڈلی تھی جو وہ مجھ سے چھپا رہی تھی —— جانے کیوں؟

ماتمی جلسہ

رات رات میں یہ خبر شہر کے اِس کونے سے اُس کونے تک پھیل گئی کہ اتاتورک کمال مرگیا ہے۔ ریڈیو کی تھرتھراتی ہوئی زبان سے یہ سنسنی پھیلانے والی خبر ایرانی ہوٹلوں میں سٹے بازوں نے سُنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاتورک کی بڑائی میں گم ہوگئے۔

ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک سٹوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سُنکر لرزاں آواز میں کہا۔ "مصطفےٰ کمال مرگیا!"

اُس کے ساتھی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی: "کیا کہا مصطفےٰ کمال مرگیا!"

اِس کے بعد دونوں میں اتاتورک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہوگئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ اب ہندوستان کا کیا ہوگا؟ میں نے سُنا تھا یہ مصطفےٰ کمال یہاں پر حملہ کرنیوالا ہے...... ہم آزاد ہوجاتے، مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی...... افسوس تقدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی!

دوسرے نے جب یہ بات سُنی تو اُس کے روئیں بدن پر چیونٹیوں کے

مانند سر کنے لگے۔ اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے دل میں جو پہلا خیال آیا، یہ تھا "مجھے کل جمعہ سے نماز شروع کر دینی چاہیئے......"

اس خیال کو بعد میں اُس نے مصطفےٰ کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور اُس کی بڑائی میں تحلیل کر دیا۔

بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش کھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے پان کی پیک بڑی صفائی سے بجلی کے کھمبے پر پھینکی اور کہا "میں مانتا ہوں، مصطفےٰ کمال بہت بڑا آدمی تھا، لیکن محمد علی بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بمبئی میں تین چار ہوٹلوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے!"

دوسرے نے جو اپنی ننگی پنڈلیوں پر سے ایک کھردرے چاقو سے میل اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا "محمد علی کی موت پر تو بڑی شاندار ہڑتال ہوئی تھی......"

"ہاں بھئی تو کل ہڑتال ہو رہی ہے کیا؟" تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹہوکا دیا۔ اُس نے جواب دیا کیوں نہ ہوگی...... ارے اتنا بڑا مسلمان مرجائے اور ہڑتال نہ ہو!"

یہ بات ایک راہ گذر نے سُن لی، اُس نے دوسرے چوک میں اپنے دوستوں سے کی اور ایک گھنٹے میں ان سب لوگوں کو جو دن کو سونے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں، معلوم ہوگیا کہ صبح ہڑتال ہو رہی ہے۔

ابو قصائی رات کو دو بجے اپنی کھولی میں آیا۔ اس نے آتے ہی طاق میں سے بہت سی چیزوں کو ادھر اُدھر اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیگچی میں پانی بھر کر اُس کو اُس میں ڈال کر گھولنا شروع کر دیا۔

اُس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی ماندی ایک کونے میں ٹاٹ پر سو رہی تھی۔ برتن کی رگڑ سُنکر جاگ پڑی۔ اُس نے لیٹے لیٹے کہا۔ "آ گئے ہو؟"

"ہاں آگیا ہوں" یہ کہکر اَبّو نے اپنی قمیص اُتار کر دیگچی میں ڈالدی اور اُسے پانی کے اندر مسلنا شروع کر دیا۔

اُس کی بیوی نے پُوچھا۔ "پر یہ تم کر کیا رہے ہو!" "مصطفےٰ کمال مر گیا ہے، کل ہڑتال ہو رہی ہے!" اُس کی بیوی یہ سُنکر گھبراہٹ کے مارے اُٹھ کھڑی ہوئی "کیا مارا ماری ہو گی؟...... میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے بڑی تنگ آ گئی ہوں" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال پر نہ جانے تو کب سُنے گا!"

اَبّو جواب میں ہنسنے لگا۔ "اری پگلی...... یہ ہندو مسلمانوں کا فساد نہیں ہے۔ مصطفےٰ کمال مر گیا ہے...... وہی جو بہت بڑا آدمی تھا..... کل اُس کے سوگ میں ہڑتال ہو گی!"

"جانے میری بلا یہ بڑا آدمی کون ہے...... پر تو یہ کر کیا رہا ہے؟" بیوی نے پوچھا "سوتا کیوں نہیں ہے!" "قمیص کو کالا رنگ دے رہا ہوں۔ ...... صبح ہمیں ہڑتال کرانے جانا ہے" یہ کہکر اُس نے قمیص نچوڑ کر دو کیلوں کے ساتھ لٹکا دی جو دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔

دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لئے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سیاہ پوش مسلمان دُکانداروں کی دُکانیں بند کرا رہے تھے اور یہ نعرے لگا رہے تھے۔ "انقلاب زندہ باد" "انقلاب زندہ باد!"

ایک ہندو نے جو اپنی دُکان کھولنے کے لئے جا رہا تھا یہ نعرے سُنے اور نعرے لگانیوالوں کو دیکھا تو چُپ چاپ ٹرام میں بیٹھکر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے ہندو اور پارسی دُکانداروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیختے چلاتے اور نعرے مارتے دیکھا تو انہوں نے جھٹ پٹ اپنی دُکانیں بند کر لیں۔

دس پندرہ سیاہ پوش گپیں ہانکتے ایک بازار سے گذر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "دوست ہڑتال ہوئی تو خوب ہے، پر ویسی نہیں ہوئی جیسی محمد علی کے ٹیم پر ہوئی تھی...... ٹرامیں تو اُسی طرح چل رہی ہیں!"

اِس ٹولی میں جو سب سے زیادہ جوشیلا تھا اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا تنک کر بولا۔ "آج بھی نہیں چلیں گی!" یہ کہکر وہ اُس ٹرام کی طرف بڑھا جو لکڑی کے ایک شیڈ کے نیچے مسافروں کو اُتار رہی تھی۔ ٹولی کے باقی آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سُرخ گاڑی کے ارد گرد تھے۔ سب مسافر زبردستی اُتار دیے گئے۔

شام کو ایک وسیع میدان میں ماتمی جلسہ ہوا۔ شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے۔ خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے باہر عارضی دُکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا، چاٹ کے چنوں اور اُبلے ہوئے آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔

جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس ہجوم میں کئی آدمی ایسے بھی چل پھر رہے تھے جو یہ معلوم کرنیکی کوشش میں مصروف تھے کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب گلے میں دُوربین لٹکائے اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہے تھے۔ دُور سے اتنی بھیڑ دیکھکر اور یہ سمجھکر کہ پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے۔ وہ ابھی ابھی اپنے گھر سے نئی دُوربین

ے کر دوڑے دوڑے آرہے تھے اور اس کا امتحان لینے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ میدان کے آہنی جنگلے کے پاس دو آدمی کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا "بھئی یہ مصطفےٰ کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے...... میں جو صابن بنانے والا ہوں اُس کا نام "کمال سوپ" رکھوں گا...... کیوں کیسا رہے گا؟"

دوسرے نے جواب دیا "وہ بھی بُرا نہیں تھا جو تم نے پہلے سوچا تھا "جناح سوپ"...... یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے!"

"نہیں، نہیں یہ "کمال سوپ" اچھا رہے گا...... بھائی مصطفےٰ کمال اس سے بڑا آدمی ہے" یہ کہکر اُس نے اپنے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "آؤ چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے" وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چلدیئے۔

جلسہ شروع ہوا۔

آغاز میں نظمیں گائی گئیں جن میں مصطفےٰ کمال کی بڑائی کا ذکر تھا۔ پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لئے اُٹھے۔ آپ نے کمال اتاترک کی عظمت بڑے بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا شروع کی۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سُنتے رہے۔ جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجتے "مصطفےٰ کمال نے درۂ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کے باہر نکال دیا" یا "کمال نے یونانی بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا!" تو "اسلام زندہ باد" کے نعروں سے میدان کانپ کانپ اُٹھتا۔

یہ نعرے مقرر کی قوت گویائی کو اور تیز کر دیتے اور وہ زیادہ جوش سے اتاتورک کمال کی عظیم الشان شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔ مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں ایک جوش و خروش

پیدا کر رہا تھا۔

جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقعہ موجود ہے۔ برطانیہ کی گردن ٹرکی کے سامنے خم رہے گی۔ صرف ٹرکی ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا اور صرف مصطفےٰ کمال ہی ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی۔ اس نے بہ نوک شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ ٹرکی کو یورپ کا مردِ بیمار کہا جاتا تھا۔ مگر کمال نے اسے صحت اور قوت بخش کر مردِ آہن بنا دیا۔"

جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بلند ہوئے تو "انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد" کے نعرے پانچ منٹ تک متواتر بلند ہوتے رہے۔

اِس سے مقرر کا جوش بہت بڑھ گیا۔ اس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا "کمال کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے ملک کے لئے وہ وہ خدمات سرانجام دی ہیں جس کو بیان کرنے کے لئے کافی وقت چاہیئے۔ اس نے ٹرکی میں جہالت کا دیوالہ نکال دیا۔ تعلیم عام کر دی۔ نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا۔ یہ سب کچھ اس نے تلوار کے زور سے کیا۔ اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی مگر وہ سر بازار پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ اُس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک رُومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اُٹھانا چاہی مگر یہ آواز اُن کے گلے ہی میں دبا دی گئی۔ اُس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان میں ہو تو بہت سے مُلّاؤں نے عدول حکمی کی مگر وہ قتل کر دیئے گئے....."

"یہ کفر بکتا ہے"۔ جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ مضطرب ہو گئے۔

"یہ کافر ہے جھوٹ بولتا ہے" کے نعروں میں مقرّر کی آواز گم ہو گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا۔ جلسے میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔

اسٹیج پر مقرّر کا ایک دوست اُس کے ماتھے پر سے خون پونچھ رہا تھا اور جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج رہی تھی "مصطفےٰ کمال زندہ باد، مصطفےٰ کمال زندہ باد۔!"



تلوّن

بارش کا شور ـــــ آہستہ آہستہ یہ شور شدت پکڑتا ہے۔

نیلم۔ (ڈرتے ہوئے لہجہ میں) کھڑکی بند کر دو جمیل ـــــ "باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے" ـــــ اُف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے۔

جمیل۔ (جلدی سے) اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری کالی زلفیں ہیں۔

نیلم۔ تو ڈرنا چاہیئے آپ کو۔

جمیل۔ (ہنستا ہے) ان کالی رسیوں سے جو سانپ کی طرح بل تو کھاتی ہیں مگر ڈس نہیں سکتیں۔ (ہنستا ہے) تمہارے سر کے یہ کالے دھاگے صرف شاعروں ہی کے لئے جال بن سکتے ہیں نیلم...... ہاں تو کھڑکی کیا سچ مچ بند کر دوں۔ ـــــ کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے۔

نیلم۔ اِس بھیانک رات سے زیادہ اِس وقت مجھے تم سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

(کھڑکی بند کر دیتی ہے)

جمیل۔ خوف ـــــ مجھ سے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے ـــــ ہونا چاہیئے۔ اِس لئے کہ خوف ہی تم جیسی عورتوں کو رام کر سکتا ہے۔ ـــــ وہ شاعر ـــــ وہ شاعر ـــــ کیا نام تھا اُس شاعر کا۔

نیلم - تم اپنے دوست کو اتنی جلدی بھول گئے

جمیل - میں اُسے اُس کی موت کے بعد بھولا ہوں، اِس لئے کہ اب اُس کو یاد رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا — اور تم تو اُسے اُس کی زندگی ہی میں بھول گئی تھیں۔

نیلم - خدا کے لئے — خدا کے لئے گڑے مُردے نہ اُکھاڑو جمیل!

جمیل - جو تم کفنائے بغیر دفن کر چکی ہو "— نیلم واللہ اگر میں کبھی تمہاری محبّت میں گرفتار ہو جاؤں تو مزا آجائے — تمہیں اپنی اِس انگوٹھی میں نگینے کی طرح نہ جڑ لوں تو میرا نام جمیل نہیں" — وہ لوگ بیوقوف تھے جو تمہارے عشق میں آہیں بھرتے مر گئے — مجھے تعجّب ہے کہ اُن میں سے کسی نے تمہارا گلا کیوں نہیں کاٹ ڈالا۔ یہ سفید سفید گلا جس میں سے تم اتنے اچھے سُر نکال سکتی ہو اور اپنے راگ کا جادو چلاتی ہو۔

نیلم - تم کیوں نہیں کاٹ ڈالتے۔

جمیل - اِس لئے کہ میں تم سے محبّت نہیں کرتا۔

نیلم - مانتی ہوں، لیکن پھر تم مجھ سے دلچسپی کیوں لیتے ہو؟

جمیل - سیّاح جب بمبئی میں آتے ہیں تو مالا بار کی پہاڑی پر وہ مقام دیکھنے کے لئے ضرور ٹھہر جاتے ہیں جہاں باؤلہ قتل کیا گیا تھا — میں تم سے ملتا ہوں اِس لئے کہ تم ایک ایسا تاریخی مقام بن گئی ہو جہاں کئی بیوقوفوں نے جان دی ہے۔

نیلم - تم چاہو تو شاعر بن سکتے ہو۔

جمیل - مگر تم چاہو تو کچھ بھی نہیں بن سکتیں — "عورت ازل سے ایک ہی راگ لے کر آتی ہے جسے وہ وقت بے وقت گاتی رہتی ہے" —

بتاؤ تمہارے سازِ حیات میں دھوکے اور فریب کے سوا کیا اور کوئی راگ ہے؟

نیلم۔ بہت سے راگ ہیں۔ جب تم مجھ سے محبت کروگے تو سناؤں گی ـــــ فی الحال یہ چند شعر سنو۔

جمیل۔ کیا اِس بے وقوف شاعر کے ہیں؟

نیلم۔ نہیں میرے اپنے ہیں۔

(باجے پر انگلیاں چلاتی ہے اور ذیل کے شعر گاتی ہے)

زندگی ایک سرگرانی ہے ـــ یہ مرا عالمِ جوانی ہے
یہ جو پلکوں پہ قطرہ خوں ہے ـــ تیرے اکرام کی نشانی ہے
مسکرانا جسے نصیب نہ ہو ـــ وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے

(احمد ندیم قاسمی)

جمیل۔ اچھا گاتی ہو ـــــ (گلاس میں شراب انڈیلتا ہے) ـــــ اور یہ شراب بھی بری نہیں۔

نیلم۔ (آخری شعر گاتی ہے) ....

ہے اِن آنکھوں کا رنگ پانی میں ـــ ورنہ کیا ہے شراب، پانی ہے

جمیل۔ خودستائی کا دوسرا نام عورت ہے، کیوں نیلم ـــــ؟ اور معلوم ہوتا ہے آج کسی نے تمہاری آنکھوں کی تعریف نہیں کی، جبھی تمہیں ان کا رنگ شراب میں گھولنا پڑا ـــــ بخدا نیلم تم بڑی دلچسپ عورت ہو۔ "تمہاری پلکوں میں پھنسے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے ریگستان کے کنوئیں یاد آجاتے ہیں" ـــ ہاں یہ تو بتاؤ آج تم رو کیوں رہی ہو ـــــ اگر مجھے مرعوب کرنے کے لئے تم نے یہ آنسو بہائے ہیں تو میں کہوں گا کہ تم نے ناحق

تکلیف کی ــــ میرے دل کی چھت ٹپکتی نہیں۔

نیلم۔ (باجے کے پردے چھیڑتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) ــ جمیل عورتیں روتی ہیں ــــ جانتے ہو عورتیں کیوں روتی ہیں۔

جمیل۔ کہ مرد زیادہ شراب پئیں۔ (اور شراب گلاس میں ڈالتا ہے)

نیلم۔ (تنگ آکر۔ بلند آواز میں) ــــ جمیل ــــ (ایک دم آواز دبا کر) اب میں تم سے کیا کہوں جمیل؟

جمیل۔ کہو کہ جمیل تم خوبصورت ہو ــــ تمہاری گفتگو ایسی ہے جیسے شراب کے یہ متحرک بلبلے ــــ تمہاری جوانی ایسی ہے جیسے اس ساز کے تنے ہوئے تار ــــ تم عورتوں کا ــــ تم حسین عورتوں کا ــــ کہو کیا کہو گی ــــ ہاں کہو کہ تم حسین عورتوں کا خواب جمیل ہو ــــ کہو۔ کچھ ایسا ہی کہو اور کہے چلی جاؤ ــــ اگر عورتیں اپنی تعریف سے خوش ہو سکتی ہیں تو کیا ایک مرد نہیں ہو سکتا ــــ ہاں یہ تو بتاؤ نیلم آج تمہاری شراب سسکیاں کیوں بھر رہی ہے ــــ میں نے دو گھونٹ پیے ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ میرے حلق سے دو آہیں نیچے اتر گئی ہیں ــــ یہ شراب کسی دل جلے کا تحفہ تو نہیں۔

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے۔ بارش کا شور سنائی دیتا ہے)

جمیل۔ کھڑکی بند کر دو نیلم۔ باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے ــــ اُف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے۔

نیلم۔ اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری گفتگو ہے۔

جمیل۔ تو مجھ سے ڈرنا چاہیے تمہیں۔

نیلم۔ (ہنستی ہے) ڈرنا چاہیئے ـــــ تمہاری اِن باتوں سے جو بالکل کھوکھلی ہیں (ہنستی ہے) ان چنگاریوں سے جن میں خود بھی جلنے کی قوت نہیں۔ ہاں توکھڑکی کیا سچ مچ بند کر دوں۔ کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے؟

(کھڑکی بند کر دیتی ہے)

جمیل۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام مردوں کی روحیں جو تمہاری محبّت کا زہر بن کر اس دُنیا سے اُٹھ گئے ہیں آج رات اس کالی بارش میں نہا رہی ہیں ـــــ نیلم ذرا خیال تو کرو، اگر سچ مچ یہ رُوحیں تمہارا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں تو ـــــ تو......

نیلم۔ اگر تمہاری رُوح بھی اس قطار میں ہوئی تو شاید مجھے ایک لمحے کے لئے ٹھٹکنا پڑے۔

جمیل۔ کیوں؟

نیلم۔ اِس کیوں کا جواب اُس وقت دوں گی جب تمہاری رُوح کالی بارش میں نہائے گی اور میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے گی۔

جمیل۔ تم اب دلیر ہو گئی ہو۔

نیلم۔ تم اِسے دلیری کہتے ہو مگر یہ عورت کی سب سے بڑی بزدلی ہے۔

جمیل۔ کیا؟

نیلم۔ یہی......یہی دلیری!

جمیل۔ تمہاری باتیں اِس وقت شراب کے گھونٹوں سے زیادہ مزا دے رہی ہیں۔

نیلم۔ تو شراب چھوڑ دو۔ یہی پیو۔

جمیل۔ بخدا آج تم نے میری طبیعت خوش کر دی ـــــ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ

جب میرے ہوش و حواس بجا نہ رہے تو چند دنوں کے لئے تم سے ضرور محبت کروں گا ـــــ جانتی ہو محبت کسے کہتے ہیں؟

نیلم۔ ہوش و حواس بجا نہ رہنے کی صورت میں کسی عورت سے چند دنوں کے لئے کھیلنا۔

جمیل۔ تمہاری یہ باتیں کسی روز مجھے مجبور کر دیں گی کہ میں ـــــ کہ میں.....

نیلم۔ کہو ـــــ کہو۔

جمیل۔ کہ میں تمہیں ایک کتاب بنا کر اپنی الماری میں رکھ لوں ـــــ تم سی عورتوں کو فرصت کے وقت ضرور پڑھنا چاہیئے۔

نیلم۔ پہلے قاعدہ تو پڑھ لیا ہوتا۔

جمیل۔ ہوشیار طالب علموں کے لئے ابتدائی معلومات اتنی ضروری نہیں ہوتیں۔

نیلم۔ ہائے تمہاری ہوشیاری ـــــ تمہیں اس ہوشیاری پر کتنا ناز ہے۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ہوشیاری کسی عورت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔

جمیل۔ میری ہوشمندی شاعروں کی ہوشمندی نہیں ـــــ ہاں یہ تو بتاؤ تم نے اس بیچارے شاعر سے اتنا بُرا سلوک کیوں کیا؟

نیلم۔ اس لئے کہ مجھ سے تمہارا سلوک اچھا نہیں تھا۔

جمیل۔ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آیا

نیلم۔ اور نہ کبھی آئے گا ـــــ اپنے گھروں میں آسانی کے ساتھ سوٹ کیسوں کا تالا کھولنے والے مرد جب کسی عورت کے دل کا تالا کھولنا چاہیں تو یہی مشکل پیش آیا کرتی ہے۔ اور وہ لوگ جو تم ایسے مشکل پسند ہوتے ہیں

آسانیاں اُن کے لئے دشواریاں ہوتی ہیں۔

جمیل۔ کون سی آسان بات سمجھنا میرے لئے دشوار ہے۔

نیلم۔ کہ تمہارے بُرے سلوک نے مجھے تمہارے شاعر دوست سے بُرا سلوک کرنے پر مجبور کیا۔

جمیل۔ کتنی آزادانہ مجبوری ہے۔

نیلم۔ تمہیں سیدھی سادھی بات میں اُلجھاؤ پیدا کرکے شاید لُطف آتا ہے ——— لیکن یاد رکھو کسی روز تم خود ان بھول بھلیوں میں ایسے پھنسو گے کہ نکلنے کا نام نہ لو گے ——— حقائق کا ہر وقت مُنہ چڑانا بھی اچھا نہیں۔ تم جانتے ہو ——— نہیں، تم محسوس کرتے ہو اس لئے کہ محسوس کرنا جاننے سے بہت بہتر ہے کہ "تمہارے دوست شاعر کی محبّت کو میں نے صرف اس لئے ٹھکرا دیا کہ تمہاری ٹھوکروں سے مجھے پیار ہو گیا تھا۔"

جمیل۔ میں زیادہ شراب تو نہیں پی گیا۔

نیلم۔ نہیں تم نے صرف دو گلاس پیئے ہیں ——— مدہوش میں ہو رہی ہوں۔

جمیل۔ تو پھر کوئی حرج نہیں ——— کہو کیا کہہ رہی تھیں۔ تم نے میرے شاعر دوست کی محبّت کو صرف اس لئے ٹھکرا دیا کہ میری ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا ——— ہاں پھر کیا ہوا؟

نیلم۔ جو ہونا تھا۔

جمیل۔ یعنی۔

نیلم۔ شاعروں کے سینکڑوں شعر میں ہر روز پھانکتی رہی مگر میرے دل میں محبّت کی شعریت پیدا نہ ہوئی اور تمہاری خُشک باتوں نے ....

دھڑ کی شور کے ساتھ کھلتی ہے۔ ہوا کی تیز سیٹیاں کمرے میں پھیل جاتی ہیں۔

عباس کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوتا ہے۔ نیلم چیختی ہے)...... عباس!

عباس۔ (زور سے کھڑکی بند کر دیتا ہے اور فرش پر اپنے وزنی بوٹوں کے ساتھ چلتا نیلم کے پاس آجاتا ہے) —— ہاں شاعر عباس —— مگر یہ چیخ کیسی —— کیا پرانے دوستوں کا استقبال ایسی چیخوں سے کیا جاتا ہے؟ —— اور جمیل تم کیوں ڈر گئے —— کیا میں تمہارا عزیز دوست عباس نہیں ہوں جس کے سینکڑوں شعر ہر روز پھانکنے پر بھی نیلم کے دل کا ہاضمہ دُرست نہیں ہوا —— "خبردار جو تم اپنی جگہ سے ہلے —— میرا پستول شعر نہیں کہتا۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے بدکلامی ہو جائے" —— ہاں کہو نیلم تم کیا کہہ رہی تھیں —— جمیل کی خشک باتوں نے —— جمیل کی خشک باتوں نے کیا کیا۔؟

نیلم۔ (بھینچے ہوئے لہجہ میں)...... عباس تم زندہ ہو؟

عباس۔ مجھے خود تو یہی محسوس ہوتا ہے۔

جمیل۔ ریل گاڑی کے حادثہ میں تمہارے مرجانے کی افواہ......

عباس۔ غلط تھی لیکن آج شب کے حادثے میں تمہارے مرجانے کی افواہ غلط نہ ہوگی۔

جمیل۔ تو مجھے ابھی ابھی وصیت کر دینا چاہیئے اور اپنی ساری جائداد تمہارے حق میں محفوظ کر دینا چاہیئے۔

عباس۔ تمہاری جائداد —— کیا ہے تمہاری جائداد؟

جمیل۔ میری خشک باتیں جو تمہارے شعروں کے ساتھ مل کر شاید نیلم کا دل موہ سکیں۔

عباس۔ (ایک دم غصے میں آکر)...... جو میں نہ موہ سکا۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا

تم ـــــ دبی زبان میں آج تم نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے اگر مجھے پہلے معلوم ہوتی تو میرے دل کا بوجھ اس قدر زیادہ نہ ہوتا ـــــ وہ بوجھ جواب تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑے گا ـــــ میں بیوقوف ہوں ـــــ جیسا کہ تم نیلم سے کہہ رہے تھے شاعر بے وقوف ہی ہوا کرتے ہیں مگر وہ تم جیسے غدار نہیں ہوتے ـــــ بھیڑ کی کھال میں تم جیسے چھپتے نہیں ہوتے ـــــ تم ـــــ تم ـــــ اپنی طرف سے شاید ایک دلچسپ کھیل کھیلتے رہے مگر جانتے ہو تم نے مجھے بے حد دُکھ پہنچایا ہے ـــــ تم نے میری حساس رُوح کو پاؤں تلے روند دیا ہے ـــــ تم نے شاعر کو تکلیف نہیں دی ایک انسان کو دُکھ دیا ہے جو محبت میں گرفتار تھا ـــــ جانتے ہو محبت کرنے والے انسانوں کی رُوح بہت حساس ہوتی ہے۔

جمیل۔ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

عباس۔ لیکن اب تمہیں کرنا ہوگی۔

جمیل۔ کس سے؟

عباس۔ نیلم سے ـــــ اس عورت سے جس سے میں محبت کرتا ہوں ـــــ اس مغنیہ سے جس کے حلق سے نکلے ہوئے سُروں میں اتنے برس میری رُوح آشیانہ بناتی رہی اور جس کے تنکے تم نے ہوائی بگولا بن کر اُڑا دیئے ـــــ سنتے ہو! اُس عورت سے جس کی نسوانیت میری نرم و نازک شاعری نے بنائی ہے تم اپنی کھُردری باتوں سمیت محبت کرو گے۔

جمیل۔ اور تم؟

عباس۔ میں ـــــ میں تمہارا تماشا دیکھوں گا۔

جمیل۔ تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں واقعی نیلم سے محبّت کرتا ہوں۔
عباس۔ تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہوگا ـــــ اور اس سے میری محبّت کا ثبوت یہ ہے کہ آج نصف شب کے بعد شاعر عباس، نیلم پر اپنی جان قربان کردے گا۔ ـــــ اُس دُنیا میں چلا جائے گا جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔
جمیل۔ دوسرے لفظوں میں اب مجھے اُس دُنیا میں جانا پڑے گا جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔
عباس۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو۔
نیلم۔ عباس ـــــ خُدا کے لئے عباس ایسے بے رحم نہ ہنو۔
عباس۔ اس سے تمہاری محبّت کا ثبوت لینا کوئی بے رحمی نہیں ـــــ میں بھی تو اس بات کا ثبوت دوں گا کہ مجھے تم سے محبّت ہے۔
نیلم۔ کیسے؟
عباس۔ اس گلاس میں جس میں جمیل شراب پیتا رہا ہے۔ میں زہر گھولنے لگا ہوں (گلاس کی آواز) ـــــ پہلا گھونٹ جمیل پیئے گا۔ جب زہر اس کو ہلاک کردے گا تو دوسرا گھونٹ میں پیوں گا۔
نیلم۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے عباس ـــــ تمہارا دماغ بہک گیا ہے۔
جمیل۔ اور اگر میں انکار کردوں؟
عباس۔ تو میرا پستول کبھی انکار نہیں کرے گا۔
جمیل۔ پستول کی گولی سے مرنا شاندار نہیں ـــــ میں زہر ہی پیوں گا مگر مجھے پہلے اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ میری موت کے بعد تمہاری موت بھی ہوگی ـــــ کیا نیلم مجھے اس بات کا یقین دلا سکتی ہے۔
نیلم۔ میں ـــــ میں ـــــ لیکن عباس شاعر ہے۔

جمیل۔ تو ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے عباس زہر پیئے اور اُس دُنیا کا دروازہ کھٹکھٹائے جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔ میں اس کے پیچھے آنے کا وعدہ کرتا ہوں ــــ اس تھوڑے سے وقفے میں مجھے نیلم کی محبت میں گرفتار ہونے کا موقع بھی مل جائے گا۔

نیلم۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ سارا زہر میں ہی اپنے حلق سے نیچے اُتار لوں ــــ اور تم پھر سے ایک دوسرے کے دوست بن جاؤ ــــ ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کر دو۔

عباس۔ (بلند آواز میں) نہیں ــــ ہرگز نہیں ــــ موت کا یہ جال میری مرضی کے مطابق پانی میں ڈالا جائے گا ــــ پہلے جمیل تم اس جال میں آؤ گے۔ پھر میں ــــ اور نیلم زندہ رہے گی ــــ اس کو زندہ رہنا پڑیگا ــــ جب زہر تمہارے اندر سرائیت کر جائے گا اور موت کا مضبوط ہاتھ تمہیں رسّی کے مانند بٹ دے گا تو نیلم کے دل پر تڑ تڑ تیرے پڑیں گے۔ اس نیلم کے دل پر جس نے شاعر عباس کے دل کو فضول سمجھ کر توڑ دیا۔ ــــ تم مرو گے اور میں جیوں گا۔ میں جیوں گا اور تم مرو گے (دیوانہ وار ہنستا ہے) ــــ ہاں ہاں تمہیں مرنا ہو گا ــــ میں خود مروں گا مگر زندہ ہو کر اور تم مرو گے ادھ موئے ہو کر (ہنستا ہے) برف کے ٹکڑوں سے اپنی تابانی اُدھار لینے والی نیلم کے لئے آج کڑی آزمائش کا دن ہی ــــ اس کی آنکھوں کے سامنے آج اس کے دو چاہنے والے موت کی گہرائیوں میں اُتریں گے۔

جمیل۔ مذاق ختم ہو چکا ــــ رات بہت گزر چکی ہے عباس۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب تماشے کو بند کر دینا چاہیئے ــــ نیلم برف کی سلوں سے اپنی تابانی

اُدھار لیتی ہے تم ان سے تھوڑی سی سردی مانگ لو اور خدا کے لئے اس آگ کو بجھاؤ ــــــ میں آگ تاپنے کا عادی نہیں ہوں۔

عباس۔ (زور سے قہقہہ لگاتا ہے) صرف باتیں ہی بنانے کے عادی ہو ــــــ تم آگ لگا سکتے ہو مگر آگ لگا کر اس کا تماشا دیکھنے کی تاب تم میں نہیں ــــــ نیلم تمہاری ٹھوس چٹان چٹخنا شروع ہو گئی ــــــ بس اب کچھ دم میں ریزہ ریزہ ہوا چاہتی ہے ــــــ (ہنستا ہے) ــــــ تمہیں عورتوں سے کھیلنا پسند ہے مگر زہر کا ایک گھونٹ تم سے نہیں پیا جاتا ــــــ میرے دوست، عورتیں زہر سے زیادہ زہریلی ہوتی ہیں۔

جمیل۔ ہوں گی مگر اُن کے لئے جو اُن سے دلچسپی لیتے ہیں۔

نیلم۔ عباس ــــــ جمیل ٹھیک کہتا ہے ــــــ اسے مجھ سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ میں اس کی دلچسپ باتوں میں دلچسپی لوں۔

عباس۔ کیا دلچسپ بات ہے ــــــ اور زہر کے یہ گھونٹ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ــــــ کتنے پیو گے۔ میرے لئے تو ایک ہی کافی ہو گا۔

جمیل۔ میں نہیں پیوں گا۔

عباس۔ تمہیں پینا ہو گا ــــــ (گلاس اُٹھاتا ہے) ۔ اسی شراب میں زہر ہے۔ (نیلم لپک کر ہاتھ سے گلاس گرا دیتی ہے۔ عباس اُس کی کلائی پکڑ لیتا ہے۔ نیلم کی چوڑیاں کھنکھناتی ہیں) ــــــ زہر کی پڑیا واپس دے دو نیلم۔ (نیلم، عباس کی زبردست گرفت کے باعث کراہتی ہے اور کہتی ہے "میری کلائی ٹوٹ جائے گی"!) ــــــ میرا دل ٹوٹ چکا ہے ــــــ لاؤ ــــــ یہ زہر میرے حوالے کرو۔ (نیلم کی ہلکی سی چیخ) ــــــ بس اب ایک طرف ہو جاؤ اور ہمارا تماشا دیکھو ــــــ خبردار جمیل ــــــ اپنی جگہ پر

کھڑے رہو (گلاس اُٹھاتا ہے اور اُس میں زہر کی پڑیا گھولتا ہے) ــــ لو ــــ اِس کا ایک گھونٹ پی جاؤ ــــ گلاس ہاتھ میں لو ــــ ورنہ ....

جمیل۔ (ڈرتے ہوئے لہجے میں) ــــ نیلم ــــ کیا سچ مچ مجھے یہ زہر پینا پڑے گا۔

نیلم۔ حالات کا تقاضا یہی ہے۔

جمیل۔ حالات کا تقاضا ــــ حالات کا تقاضا ــــ مجھے حالات سے کیا واسطہ ہے ــــ مجھے کسی سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے ــــ نیلم یہ کیا ہو رہا ہے ــــ خدا کے لیے مجھے اِس موت سے بچاؤ۔

نیلم۔ گلاس میں سے ایک گھونٹ پی جاؤ ــــ تم بچ جاؤ گے۔

عباس۔ (ہنستا ہے)

نیلم۔ پی جاؤ ــــ میرا مُنہ کیا دیکھتے ہو ــــ شہد سمجھ کے پی جاؤ۔

جمیل۔ شہد ــــ شہد ــــ

عباس۔ (بُلند آواز میں) پی جاؤ ــــ ورنہ ــــ

نیلم۔ پی جاؤ۔ تمہیں کچھ نہ ہو گا۔

جمیل۔ کیسے۔ کیسے؟

عباس۔ پی جاؤ۔

نیلم۔ پی جاؤ ــــ پی جاؤ ــــ

عباس۔ بس ایک گھونٹ ــــ باقی میری طرف بڑھا دو۔

نیلم۔ پی جاؤ۔ ڈرو نہیں۔

جمیل۔ پی جاؤں۔

عباس۔ ہاں۔ ہاں۔ پی جاؤ۔

نیلم۔ پی جاؤ۔

جمیل۔ تم بھی پیوگے۔

عباس۔ وقت ضائع نہ کرو جمیل۔

نیلم۔ ڈرتے کیوں ہو۔

جمیل۔ (گلاس میں سے زہر پیتا ہے۔ حلق میں غرغراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پھر کھانستا ہے)

نیلم۔ بس اتنی سی بات تھی۔

عباس۔ بس اتنی سی بات تھی ——— لاؤ گلاس مجھے دو ——— شاباش ——— ارے تمہارا رنگ اتنی جلدی زرد کیوں ہوگیا ——— ابھی تو زہر تمہارے اندر ٹھیک طور سے اُترا بھی نہیں۔

نیلم۔ گھبراؤ نہیں جمیل ——— حوصلہ رکھو۔

عباس۔ حوصلہ؟ ——— زہر پی کر یہ کس قسم کا حوصلہ کر سکتا ہے۔ لو دیکھو ——— مٹھیاں بھینچنا شروع ہوگئیں۔

جمیل۔ عباس ———

عباس۔ عباس کو کیوں پکارتے ہو ——— اس کا نام نہ لو ورنہ تمہاری جان اٹک جائے گی۔

نیلم۔ پریشان کیوں ہوتے ہو جمیل ——— تم نہیں مروگے۔

جمیل۔ نیلم ——— ہیں ———

عباس۔ (زور زور سے ہنستا ہے) ہا ہا ہا ——— بس پانچ منٹ میں تمہاری لاش اس فرش پر ہوگی اور مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں گی۔ تمہارے اس منحوس چہرے پر جو ابھی سے نیلا پڑ گیا ہے۔

جمیل۔ نیلا! ___ تم قاتل ہو ___ تم میرے قاتل ہو ___ میں شور مچانا شروع کر دوں گا ___ میں چلاّنا شروع کر دوں گا ___'

عباس۔ کچھ فائدہ نہ ہوگا ___ چیخنے اور چلاّنے سے جو کام تم کرنا چاہتے ہو وہ میں خود کرنے والا ہوں ___ اس گلاس کا باقی زہر ابھی میرے اندر چلا جائے گا ___ مگر تمہیں پہلے مرنا ہوگا ___ تم میری جانکنی کا تماشا نہیں دیکھو گے ___ اس کا مزا صرف میں لوں گا (ہنستا ہے) نیلم ___ ذرا اس بہادر کی حالت تو دیکھو جس کی ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا (ہنستا ہے) ہا ہا ہا ___ تم کانپ رہے ہو جمیل ___ تمہارا رواں رواں کانپ رہا ہے ___ زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ___ بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو۔

جمیل۔ (دیوانہ وار) ___ میں نہیں مرنا چاہتا ___ میں نہیں مرنا چاہتا ___ کوئی مجھے بچائے۔ کوئی مجھے بچائے۔

عباس۔ شریف آدمیوں کی طرح جان دو جمیل ___ یوں چیخو چلاّؤ نہیں ___ موت بہت حساس ہوتی ہے۔

جمیل۔ موت ___ موت ___'

نیلم۔ ڈرو نہیں، تم زندہ رہو گے۔

عباس۔ (ہنستا ہے) تم زندہ نہ رہو گے اس لئے کہ تم اس عورت کے لئے اپنی جان دے رہے ہو (ہنستا ہے) ___ تمہارا رنگ اب بالکل نیلا پڑ گیا ہے ___ "تمہارے ہونٹ خزاں دیدہ پتوں کے مانند کانپ رہے ہیں ___ تمہاری آنکھیں بلبلوں کی طرح اُبل رہی ہیں" (ہنستا ہے) بس۔ اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو ___ کچھ کہنا ہو تو کہہ لو نیلم سے (ہنستا ہے)

میں کتنا خوش ہوں ـــــ (ہنستا ہے) ـــــ (قہقہوں کے درمیان جمیل دیوانہ وار چلاّتا ہے۔ "پانی پانی"! نیلم کہتی ہے ـــــ "تمہیں کیا ہو گیا؟" جمیل ـــــ تم تو سچ مچ مر رہے ہو" ـــــ عباس ہنستا رہتا ہے ـــــ آخر میں دھڑام سے جمیل زمین پر گر پڑتا ہے۔)

عباس۔ مر گیا ـــــ لو اب میں چلا ـــــ (اُسی گلاس میں سے زہر پیتا ہے اور ہونٹ چاٹتا ہے) ـــــ لوگ کہتے ہیں زہر کڑوا ہوتا ہے مگر یہ تو میٹھا تھا۔

نیلم۔ جمیل! ـــــ جمیل! ـــــ جمیل! ـــــ عباس جمیل تو سچ مچ مر گیا۔

عباس۔ تو کیا جھوٹ موٹ کی موت مرتا۔ نیلم اب اس کا ذکر نہ کرو جو مر کھپ چکا ہے۔ میرے ساتھ باتیں کرو جو ابھی مرا نہیں ہے (ہنستا ہے) ـــــ "موت ـــــ موت اور زندگی میں فرق ہی کیا ہے ـــــ زندگی ایک نیند ہے جس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور موت ایسی نیند ہے جس میں آنکھیں بند رہتی ہیں۔"

نیلم۔ (آہ بھر کر) جمیل مر گیا۔

عباس۔ اور اب میری باری ہے ـــــ ایک مرد جس سے تمہیں محبت تھی موت کی آغوش میں جا چکا ہے ـــــ دوسرا جس کو تم سے محبت ہے جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

نیلم۔ تم غلط کہتے ہو ـــــ مجھے جمیل سے محبت نہیں تھی۔

عباس۔ پھر کس سے تھی؟

نیلم۔ اِس کی خشک باتوں سے ـــــ تم لوگ اتنی معمولی سی بات کیوں نہیں سمجھتے ـــــ بادلوں میں گھرے ہوئے لوگ کیا صاف آسمان کی خواہش

نہیں کرتے ـــــ برف کے تودوں میں دبی ہوئی چیزیں کیا سورج کی تپش کے لئے نہیں تڑپتیں ـــــ زمین پر رہنے والے کیا تاروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتے ـــــ کیا فرشتوں نے آسمان چھوڑ کر زمین پر آنے کی غلطی نہیں کی ـــــ شعروں کے نرم و نازک بستر سے نکل کر حقیقت کے پتھروں پر چلنے پھرنے کی خواہش کیا دل میں پیدا نہیں ہو سکتی ـــــ اور پھر نیلم تو ایک عورت ہے۔

عباس۔ عورتوں اور چڑیوں کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ اُدنچا رہا ہے۔

نیلم۔ اِس لئے کہ تم شاعر زیادہ اور آدمی کم ہو ـــــ عباس ہر شے کو شعریت کی نظروں سے دیکھو مگر عورت کو ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھو۔"

عباس۔ (ہنستا ہے) یہ دونوں آنکھیں اب موت ہمیشہ کے لئے میچ دے گی۔ (حیرت سے) مگر اِس زہر نے مجھ پر اثر کیوں نہیں کیا ـــــ میں ـــــ میں موت کو اپنے قریب محسوس کیوں نہیں کرتا ـــــ میرا حلق بھی تو خشک نہیں ہوا ـــــ میرا رنگ بھی ویسے کا ویسا ہے۔

نیلم۔ اِس لئے کہ تم نے زہر نہیں پیا۔

عباس۔ (حیرت سے) زہر نہیں پیا ـــــ جمیل کیسے مر گیا؟

نیلم۔ مر گیا ـــــ اُس کی ہوشیاری اور چالاکی اس کی مدد نہ کر سکی ـــــ حالانکہ میں نے تم دونوں کو بچانے کے لئے کوشِش کی تھی ـــــ زہر کی پُڑیا کے بجائے میں نے شکر کی پڑیا بڑی پھرتی سے تمہارے ہاتھ میں دے دی تھی۔

عباس۔ پہیلیاں بوجھنے کے فن سے میں بالکل کورا ہوں نیلم!

نیلم۔ اِسی لئے تم مرے نہیں ـــــ اگر جمیل نے زہر پیا ہوتا تو شاید وہ نہ مرتا۔

مگر شکر نے اُس پر زہر کا کام کیا — اب چھوڑو اِن باتوں کو۔

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھُل جاتی ہے۔ بارش کا شور سُنائی دیتا ہے)

نیلم۔ کھڑکی بند کر دو عباس — باہر رات کا اندھیرا ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیل کی رُوح اِس کالی بارش میں نہا رہی ہے — اُف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے ....

عباس۔ اتنی بھیانک نہیں جتنا تمہارا سفید چہرہ ہے ......

(کھڑکی بند کر دیتا ہے)

سجدہ

گلاس پر بوتل جھکی تو ایک دم حمید کی طبیعت پر بوجھ سا پڑ گیا۔ ملک جو اُس کے سامنے تیسرا پیگ پی رہا تھا فوراً تاڑ گیا کہ حمید کے اندر رُوحانی کشمکش پیدا ہو گئی ہے۔ وہ حمید کو سات برس سے جانتا تھا، اور ان سات برسوں میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے جن کا مطلب اس کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا تھا۔ لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے لاغر دوست کے سینے پر کوئی بوجھ ہے، ایسا بوجھ جس کا احساس شراب پینے کے دوران میں کبھی کبھی حمید کے اندر یوں پیدا ہوتا ہے جیسے بے دھیان بیٹھے ہوئے آدمی کی پسلیوں میں کوئی زور سے ٹھوکا دیدے۔

حمید بڑا خوش باش انسان تھا۔ ہنسی مذاق کا عادی، حاضر جواب، بذلہ سنج، اس میں بہت سی خوبیاں تھیں جو زیادہ نزدیک آکر اُس کے دوست ملک نے معلوم کی تھیں۔ مثال کے طور پر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بیحد مخلص تھا، اس قدر مخلص کہ بعض اوقات اس کا اخلاص ملک کے لئے عہد عتیق کا رومانی افسانہ بن جاتا تھا۔

حمید کے کردار میں ایک عجیب و غریب بات جو ملک نے نوٹ کی یہ تھی کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے نا آشنا تھیں۔ یوں تو ملک بھی رونے کے معاملے

میں بڑا بخیل تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب کبھی رونے کا موقع آئے گا وہ ضرور رو دیگا۔ اُس پر غم افزا باتیں اثر ضرور کرتی تھیں مگر وہ اِس اثر کو اتنی دیر اپنے دماغ پر بیٹھنے کی اجازت دیتا تھا جتنی دیر گھوڑا اپنے تنے ہوئے جسم پر مکھی کو۔

"غموں سے دُور رہنے والے اور ہر وقت ہنسی مذاق کے عادی حمید کی زندگی میں نہ جانے ایسا کونسا واقعہ اُلجھا ہوا تھا کہ وہ کبھی کبھی قبرستان کی طرح خاموش ہوجاتا تھا"۔ ایسے لمحات جب اُس پر طاری ہوتے تو اُسکا چہرہ ایسی رنگت اختیار کرلیتا تھا جو تین دن کی باسی شراب میں بیجان سوڈا گھولنے سے پیدا ہوتی ہے۔"

سات برس کے دوران میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے مگر ملک نے آج تک اُس سے ان کی وجہ دریافت نہ کی تھی۔ اس لئے نہیں کہ ان کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ ملک پرلے درجے کا سُست اور کاہل واقع ہوا تھا۔ اس خیال سے بھی وہ حمید کے ساتھ اِس معاملے پر بات چیت نہیں کرتا تھا کہ ایک طول طویل کہانی اُسے سُننا پڑے گی اور اس کے چوتھے پیگ کا سارا سرور غارت ہوجائیگا شراب پی کر لمبی چوڑی آپ بیتیاں سُننا یا سُنانا اُس کے نزدیک بہت بڑی بدذوقی تھی۔ اِس کے علاوہ وہ کہانیاں سُننے کے معاملے میں بہت ہی خام تھا۔ اسی خیال کی وجہ سے کہ وہ اطمینان سے حمید کی داستان نہیں سُن سکے گا اُس نے آج تک اُس سے اُن دوروں کی بابت دریافت نہیں کیا تھا۔

کرپارام نے حمید کے گلاس میں تیسرا پیگ ڈال کر بوتل میز پر رکھدی اور ملک سے مخاطب ہوا۔ "ملک، اِسے کیا ہوگیا ہے"؟

ملک خاموش رہا لیکن حمید مضطرب ہوگیا۔ اُس کے تنے ہوئے اعصاب

زور سے کانپ اُٹھے۔ کرپارام کی طرف دیکھ کر اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ اسمیں جب ناکامی ہوئی تو اس کا اضطراب اور بھی زیادہ ہو گیا۔

"حمید کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا اور اگر چھپانے کی کوشش کرتا تو اس کی وہی حالت ہوتی جو آندھی میں صرف ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی عورت کی ہوتی ہے۔"

ملک نے اپنا تبسم ایمگ ختم کیا اور اُس فضا کو جو کچھ عرصہ پہلے طرب افزا بالوں سے گونج رہی تھی اپنی بے محل ہنسی سے خوشگوار بنانے کے لئے اُس نے کرپارام سے مخاطب ہو کر کہا "کرپا ـــــ تم مان لو اسے اشوک کمار کا فلمی عشق ہو گیا ہے ـــــ بھئی یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کاسٹرائل پی رہا ہے۔"

کرپارام، اشوک کمار کو اتنا ہی جانتا تھا جتنا کہ مہاراجہ اشوک اور اُس کی مشہور آہنی لاٹھ کو۔ فلم اور تاریخ سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، البتہ وہ ان کے فوائد سے ضرور آگاہ تھا۔ کیونکہ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا۔ "مجھے اگر کبھی شب خوابی کا عارضہ لاحق ہو جائے تو میں یا تو فلم دیکھنا شروع کر دوں گا یا چکرورتی کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھنا شروع کر دوں گا۔"

وہ ہمیشہ حساب داں چکرورتی کو مورخ بنا کر اپنی مسرت کے لئے ایک بات پیدا کر لیا کرتا تھا۔

کرپارام چار پیگ پی چکا تھا۔ چار پیالہ پیگ، نشہ اُس کے دماغ کی آخری منزل تک پہونچ چکا تھا۔ آنکھیں سُکیڑ کر اُس نے حمید کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ کیمرے کا فوکس کر رہا ہے۔ "تمہارا گلاس ابھی تک ویسے کا ویسا پڑا ہے۔"

حمید نے دردِ سر کے مریض کی سی شکل بنا کر کہا۔"بس ــــــ اب مجھ سے زیادہ نہیں پی جائے گی۔"

"تم چُغد ہو ــــــ نہیں چُغد نہیں کچھ اور ہو۔۔۔۔۔۔ تمہیں پینا ہوگی ــــــ سمجھے یہ گلاس اور اس بوتل میں جتنی پڑی ہے سب کی سب تمہیں پینا ہوگی۔ شراب سے جو انکار کرے وہ انسان نہیں حیوان ہے ــــــ حیوان بھی نہیں، اس لئے کہ حیوانوں کو اگر انسان بنا دیا جائے تو وہ بھی اس خوبصورت شئے کو کبھی نہ چھوڑیں۔ تم سُن رہے ہو ملک ــــــ میں نے اگر یہ ساری شراب اس کے حلق میں نہ انڈیل دی تو میرا نام کرپا رام نہیں گھسیٹا رام آرٹسٹ ہے۔"

گھسیٹا رام آرٹسٹ سے کرپا رام کو سخت نفرت تھی صرف اس لئے کہ آرٹسٹ ہو کر اُس کا نام گھسیٹا رام تھا۔

ملک کا مُنہ سوڈا اور وِسکی سے بھرا ہوا تھا۔ کرپا رام کی بات سُنکر وہ بے اختیار ہنس پڑا جس کے باعث اُس کے مُنہ سے ایک فوّارہ سا چھوٹ پڑا۔ "کرپا رام خدا کے لئے تم گھسیٹا رام آرٹسٹ کا نام نہ لیا کرو۔ میری انتڑیوں میں ایک طوفان سا مچ جاتا ہے ــــــ لاحول ولا ــــــ میری پتلون کا ستیاناس ہو گیا ہے ــــــ لو بھئی، حمید، اب تو تمہیں پینا ہی پڑے گی۔ کرپا رام، گھسیٹا رام بنے یا نہ بنے لیکن میں ضرور کرپا رام بن جاؤں گا اگر تم نے یہ گلاس خالی نہ کیا ــــــ لو پیو ــــــ پی جاؤ ــــــ ارے، میرا مُنہ کیا دیکھتے ہو ــــــ یہ تمہارے چہرے پر تباہی کیسی برس رہی ہے ــــــ کرپا رام اٹھو ــــــ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ زبردستی کرنا ہی پڑے گی ــــــ"

کرپا رام اور ملک دونوں اُٹھے اور حمید کو زبردستی پلانے کی کوشش کرنے لگے۔ حمید کو رُوحانی کوفت تو ویسے ہی محسوس ہو رہی تھی، اب جب کرپا رام

اور ملک نے اس کو بھنجوڑنا شروع کیا تو اُس کو جسمانی اذیت بھی پہونچی جس کے باعث وہ بیحد پریشان ہو گیا۔

اُس کی پریشانی سے کرپا رام اور ملک بہت محظوظ ہوئے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک کھیل سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔ کرپا رام نے گلاس پکڑ کر اُس کے سر میں تھوڑی سی شراب ڈال دی۔ اور نائیوں کے انداز میں جب اُس نے حمید کا سر سہلایا تو وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اُس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ اُس کی آواز بھرا گئی۔ اُس کے سارے جسم میں تشنج سا پیدا ہوا اور ایک دم کاندھے ڈھیلے کر کے اُس نے رونی اور مُردہ آواز میں کہا۔ "میں بیمار ہوں...... خدا کیلئے مجھے تنگ نہ کرو۔"

کرپا رام اِسے بہانہ سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنے کیلئے کوئی نیا طریقہ سوچنے ہی والا تھا کہ ملک نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے پرے ہٹا دیا۔ "کرپا، اِس کی طبیعت واقعی خراب ہے...... دیکھو تو رو رہا ہے۔"

کرپا رام نے اپنی موٹی کمر جھکا کر غور سے دیکھا۔ "ارے.... تم تو سچ مچ رو رہے ہو۔"

حمید کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، جس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ —— خیر تو ہے؟"

"یہ تم رو کیوں رہے ہو؟"

"بھئی حد ہو گئی —— ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔"

"کچھ سمجھ میں بھی تو آئے —— کیا تکلیف ہے تمہیں؟"

ملک اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ "بھئی مجھے معاف کر دو اگر مجھ سے کوئی غلطی

ہوگئی ہو۔"

حمید نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ جذبات کی شدت کے باعث اُسکی قوتِ گویائی جواب دے گئی۔

"تیسرے پیگ سے پہلے اُسکے چہرے پر رونق تھی، اُسکی باتیں سوڈے کے بلبلوں کی طرح تروتازہ اور شگفتہ تھیں مگر اب وہ باسی شراب کی طرح بے رونق تھا۔ وہ سکڑ سا گیا تھا۔ اُس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی بھیگی ہوئی پتلون کی ہوتی ہے۔"

"کرسی پر وہ اِس انداز سے بیٹھا تھا گویا وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔ اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سُنایا گیا ہو۔"

ملک کو اُس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ "حمید، لو اب خدا کے لئے چُپ ہو جاؤ ـــــ واللہ تمہارے آنسوؤں سے مجھے رُوحانی تکلیف ہو رہی ہے۔ مزا تو سب کرکرا ہو ہی گیا تھا مگر یوں تمہارے ایکا ایکی آنسو بہانے سے میں بہت مغموم ہو گیا ہوں ـــــ خدا جانے تمہیں کیا تکلیف ہے ـــــ؟"

"کچھ نہیں، میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھے ایسی تکلیف ہو جایا کرتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ "اب میں اجازت چاہتا ہوں۔"

کرپارام بوتل میں بچی ہوئی شراب کو دیکھتا رہا اور ملک یہ ارادہ کرتا رہا کہ حمید سے آج پوچھ ہی لے کہ وقتاً فوقتاً اُسے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں مگر وہ جا چُکا تھا۔

حمید گھر پہونچا تو اُس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ کمرے میں چونکہ اُس کے سوا اور کوئی نہیں تھا اس لئے وہ رو بھی نہ سکتا تھا۔ اُس کی آنسوؤں سے

لبالب بھری ہوئی آنکھوں کو کرسیاں اور میزیں نہیں چھلکا سکتی تھیں۔

اس کی خواہش تھی کہ اُس کے پاس کوئی آدمی موجود ہو جس کے چھیڑنے سے وہ جی بھر کے رو سکے۔ مگر ساتھ ہی اُس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ بالکل اکیلا ہو۔ ایک عجیب کشمکش اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دُور پڑا ہے۔ سامنے میز پر اُس کی ایک پُرانی تصویر چمکدار فریم میں جڑی رکھی تھی۔ حمید نے اُداس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا تو سات برس اُس تصویر اور اُس کے درمیان تھان کی طرح کھلتے چلے گئے ——!

ٹھیک سات برس پہلے برسات کے انہی دنوں میں رات کو وہ ریلوے رسٹوران میں ملک عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھا تھا —— اُس وقت کے حمید اور اِس وقت کے حمید میں کتنا فرق تھا —— کتنا فرق تھا۔ حمید نے یہ فرق اِس شدّت سے محسوس کیا کہ اُسے اپنی تصویر میں ایک ایسا آدمی نظر آیا جس سے ملے اُس کو ایک زمانہ گذر گیا ہے۔

اُس نے تصویر کو غور سے دیکھا تو اُس کے دل میں یہ تلخ احساس پیدا ہوا کہ انسانیت کے لحاظ سے وہ اس کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ تصویر میں جو حمید ہے اس حمید کے مقابلے میں بدرجہا افضل و برتر ہے جو کرسی پر سر نیوڑھائے بیٹھا ہے۔ چنانچہ اس احساس نے اُسکے دل میں حسد بھی پیدا کر دیا۔

ایک سجدے —— صرف ایک سجدے نے اُسکا ستیاناس کر دیا تھا۔

آج سے ٹھیک سات برس پہلے کا ذکر ہے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ رات کو وہ ریلوے رسٹوران میں اپنے دوست ملک عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حمید کو یہ شرارت سوجھی تھی کہ بغیر بُو کی شراب جن کا ایک پورا پیگ لیمونیڈ میں ملا کر اُس کو

پلادے اور جب وہ پی جائے تو آہستہ سے اُسکے کان میں کہے" مولانا ایک پورا پیگ آپ کے ثوابوں بھرے پیٹ میں داخل ہو چکا ہے۔"

بیرے سے مل ملا کر اُس نے اِس بات کا انتظام کر دیا تھا کہ آرڈر دینے پر لیمونیڈ کی بوتل میں جن کا ایک پگ ڈال کر ملک کو دیدیا جائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حمید نے وِسکی پی اور ملک بظاہر بے خبری کی حالت میں جن کا پورا پیگ چڑھا گیا۔

حمید چونکہ تین پیگ پینے کا ارادہ رکھتا تھا اس لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے پوچھا" ملک صاحب، آپ یوں بیکار نہ بیٹھئے میں تیسرا پیگ بڑی عیاشی سے پیا کرتا ہوں۔ آپ ایک اور لیمونیڈ منگوا لیجئے۔"

ملک رضامند ہو گیا، چنانچہ ایک اور لیمونیڈ آگیا۔ اس میں بیرے نے اپنی طرف سے جن کا ایک پیگ ملا دیا تھا۔

ملک سے حمید کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حمید اس شرارت سے باز رہتا مگر اُن دنوں وہ اس قدر زندہ دل اور شرارت پسند تھا کہ جب بیرا ملک کے لئے لیمونیڈ کا دوسرا گلاس لایا اور اُس کی طرف دیکھکر مُسکرایا تو وہ اس خیال سے بہت خوش ہوا کہ ایک کے بجائے دو پیگ ملک کے پیٹ کے اندر چلے جائیں گے۔

"ملک آہستہ آہستہ لیمونیڈ مِلی جن پیتا رہا اور حمید دل ہی دل میں اُس کبوتر کی طرح گٹگٹاتا رہا جس کے پاس ایک کبوتری آ بیٹھی ہو۔"

اُس نے جلدی جلدی اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور ملک سے پوچھا" اور پئیں گے آپ؟"

ملک نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا" نہیں" پھر اُس نے بڑے

روکھے انداز میں کہا" اگر تمہیں اور بیٹھنا ہے تو بیٹھو میں جاؤنگا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔"

اِس مختصر گفت گو کے بعد دونوں اُٹھے۔ حمید نے دوسرے کمرے میں جاکر بل ادا کیا۔ جب وہ رسٹوران سے باہر نکلے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حمید کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ وہ ملک پر اپنی شرارت واضح کر دے مگر اچھے موقع کی تلاش میں کافی وقت گذر گیا۔ ملک بالکل خاموش تھا اور حمید کے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ رہی تھی۔ بیشمار ننھی ننھی خوبصورت اور شوخ و شنگ باتیں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو ہو کر بجھ رہی تھیں۔ وہ ملک کی خاموشی سے پریشان ہو رہا تھا اور جب اُس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا تو آہستہ آہستہ اُس کی طبیعت پر ایک افسردگی سی طاری ہو گئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اُسکی شرارت اب دُم کٹی گلہری بنکر رہ گئی ہے۔

دیر تک دونوں بالکل خاموش چلتے رہے۔ جب کمپنی باغ آیا تو ملک ایک بنچ پر مفکرانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ چند لمحات ایسی خاموشی میں گذرے کہ حمید کے دل میں وہاں سے اُٹھ بھاگنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر اُس وقت زیادہ دیر تک دبے رہنے کے باعث اس کی تمام تیزی اور طراری ماند پڑ چکی تھی۔

ملک بنچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا "حمید، تم نے آج مجھے رُوحانی تکلیف پہونچائی ہے ___ تمہیں یہ شرارت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔" اُس کی آواز میں درد پیدا ہو گیا۔ "تم نہیں جانتے کہ تمہاری اِس شرارت سے مجھے کسقدر رُوحانی تکلیف پہونچی ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور حمید اپنے آپ کو بڑی شدّت سے گناہگار محسوس کرنے لگا۔ معافی مانگنے کا خیال اُس کو آیا تھا مگر ملک باغ سے نکل کر باہر

سڑک پر پہونچ چکا تھا۔

ملک کے چلے جانے کے بعد حمید گناہ اور ثواب کے چکر میں پھنس گیا۔ شراب کے حرام ہونے کے متعلق اُس نے جتنی باتیں لوگوں سے سُنی تھیں سب کی سب اسکے کانوں میں بھنبھنانے لگیں :۔

"شراب اخلاق بگاڑ دیتی ہے ——— شراب، خانہ خراب ہے، شراب پی کر آدمی بے ادب اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ شراب اسی لئے حرام ہے۔ شراب صحت کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ اس کے پینے سے پھیپھڑے چھلنی ہو جاتے ہیں ——— شراب......"

شراب، شراب کی ایک لامتناہی گردان حمید کے دماغ میں شروع ہو گئی۔ اور اس کی تمام برائیاں ایک ایک کر کے اُس کے سامنے آگئیں۔

"سب سے بڑی برائی تو یہ ہے" حمید نے محسوس کیا "کہ میں نے بے ضرر شرارت سمجھ کر ایک شریف آدمی کو دھوکے سے شراب پلا دی ہے۔ ممکن ہے وہ پکا نمازی اور پرہیزگار ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی میری ہے اور سارا گناہ میرے ہی سر ہو گا مگر اُسے جو روحانی تکلیف پہونچی ہے اُس کا کیا ہو گا؟ واللہ باللہ میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اُسے تکلیف پہونچے ——— میں اُس سے معافی مانگ لونگا اور...... لیکن اس سے معافی مانگ کر بھی تو میرا گناہ ہلکا نہیں ہو گا۔ ایک میں نے شراب پی اُدپر سے اس کو دھوکا دیکر پلائی۔"

وسکی کا اثر اُس کے دماغ میں جمائیاں لینے لگا جس سے اُس کا احساسِ گناہ گھناؤنی شکل اختیار کر گیا۔ "مجھے معافی مانگنی چاہیئے۔ مجھے شراب چھوڑ دینی چاہیئے ——— مجھے گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنی چاہیئے۔"

اُس کو شراب شروع کئے صرف دو برس ہوئے تھے۔ ابھی تک وہ اُس کا

عادی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اُس نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دوسری باتوں کے ساتھ اس پر بھی غور کیا۔ "میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ یہ کوئی ضروری چیز نہیں۔ میں اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں ——— دُنیا کہتی ہے...... دُنیا کہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مُنہ سے لگی ہوئی یہ چھٹ ہی نہیں سکتی۔ میں اسے بالکل چھوڑ دوں گا ——— میں اس خیال کو غلط ثابت کر دوں گا۔"

یہ سوچتے ہوئے حمید نے خود کو ایک ہیرو محسوس کیا۔ پھر ایک دم اُس کے دماغ میں خدا کا خیال آیا جس نے اسے تباہی سے بچا لیا تھا۔ "مجھے شکر بجا لانا چاہیئے کہ میرے سینے میں نور پیدا ہو گیا ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس کھائی میں پڑا رہتا۔"

وہ اپنی گلی میں پہونچ چکا تھا اوپر آسمان پر گدلے بادلوں میں چاند صابن کے جھاگ لگے گالوں ... کر رہا تھا۔ ہوا خُنک تھی۔ فضا بالکل خاموش تھی ——— حمید پر خدا کے رُعب اور شراب نوشی سے بچ جانے کے احساس نے رقّت طاری کر دی۔ اُس نے شکرانے کا سجدہ کرنا چاہا ——— وہیں پتھریلی زمین پر اُس نے گھٹنے ٹیک کر اپنا ماتھا رگڑنا چاہا۔ اس خیال سے کہ اُسے کوئی دیکھ لے گا وہ کچھ دیر کے لئے ٹھٹک گیا مگر فوراً ہی یہ سوچ کر کہ یوں خدا کی نگاہوں میں اُس کی وقعت بڑھ جائے گی وہ ڈُبکی لگانے کے انداز میں جھکا اور اپنی پیشانی گلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھریلے فرش کے ساتھ جوڑ دی۔

جب وہ اُٹھا تو اُس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑا آدمی محسوس کیا۔ اُس نے جب اُس پاس کی اُونچی دیواروں کو دیکھا تو وہ اُسے اپنے قد کے مقابلے میں بہت پست معلوم ہوئیں۔

اِس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد اسی کمرے میں جہاں اب حمید بیٹھا اپنی

سات برس کی پرانی تصویر پر رشک کھا رہا تھا، اُس کا دوست ملک آیا۔ اندر آتے ہی اُس نے اپنی جیب سے بلیک اینڈ وائٹ کا ادھا نکالا اور زور سے میز پر رکھ کر کہا "حمید آؤ ــــ آج پئیں اور خوب پئیں ــــ یہ ختم ہو جائے گی تو اور لائیں گے۔"

حمید اس قدر متحیر ہوا کہ وہ اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ملک نے دوسری جیب سے سوڈے کی بوتل نکالی، تپائی پر سے گلاس اٹھا کر اُس میں شراب اُنڈیلی، سوڈے کی بوتل انگوٹھے سے کھولی، اور حمید کی متحیر آنکھوں کے سامنے وہ دو پیگ غٹاغٹ پی گیا۔

حمید نے تتلاتے ہوئے کہا "لیکن.... لیکن....... اُس روز تم نے مجھے اتنا برا بھلا کہا تھا......"

ملک نے ایک قہقہہ بلند کیا "تم نے مجھ سے ت... یا نے بھی اس کے جواب میں تم سے شرارتاً کچھ کہہ دیا ــــ مگر بھئی ایمان کی بات ہے جو مزہ اُس روز جن کے دو پگ پینے میں آیا ہے زندگی بھر کبھی نہیں آئے گا ــــ لو اب چھوڑو اس قصے کو ــــ دکھی ہو۔ جن دِن بکواس ہے۔ شراب پینی ہو تو وِسکی پینی چاہیئے۔"

یہ سُنکر حمید کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ جو سجدہ اُس نے گلی میں کیا تھا ٹھنڈے فرش سے نکل کر اُس کی پیشانی پر چپک گیا ہے۔

یہ سجدہ بھوت کی طرح حمید کی زندگی سے چمٹ گیا تھا۔ اُس نے اِس سے نجات حاصل کرنیکے لئے پھر پینا شروع کی مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اُن سات برسوں میں جو اُس کی پرانی تصویر اور اُس کے درمیان کھلے ہوئے تھے یہ ایک سجدہ بے شمار مرتبہ حمید کو اس کی اپنی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کر چکا تھا۔ اُس کی خودی، اُس کی تخلیقی قوت، اُس کی زندگی وہ حرارت جس سے

حمید اپنے ماحول کو گرما کے رکھنا چاہتا تھا اس سجدے نے قریب قریب سرد کر دی تھی۔ یہ سجدہ اُس کی زندگی میں ایک ایسی خراب بریک بن گئی تھی جو کبھی اپنے آپ اُس کے چلتے ہوئے پہیوں کو ایک دھچکے کے ساتھ ٹھہرا دیتی تھی۔

سات برس کی پرانی تصویر اُس کے سامنے میز پر پڑی تھی۔ جب سارا واقعہ اُس کے دماغ میں پوری تفصیل کے ساتھ دُہرایا جا چکا تو اس کے اندر ایک ناقابلِ بیان اضطراب پیدا ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اُس کو قے ہونے والی ہے۔

وہ گھبرا کر اُٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اُس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اُس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اُسے جب جسمانی تکلیف پہونچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا ـــــ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اُس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اے خدا، میرا سجدہ مجھے واپس دیدے۔۔۔"

"کالی شلوار"

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اُس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جُلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جُملے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اُس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اُس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ "دِس لیف ویری بیڈ"۔ یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اُس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اُس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے، اُس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر اُن کی زبان سے یہ لاعلمی اُس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اُس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی۔ "صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔" اور اگر وہ اُس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ اُن کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اُس کے مُنہ کی طرف دیکھتے تو وہ اُن سے کہتی "صاحب، تم ایک دم اُلّو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے۔ سمجھا۔"

یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ اُن سے باتیں کرتی۔ یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلّو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اُس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اُس کو ہندوستان کے اُس شہر میں رہتے ہوگئے تھے جہاں اُس نے سُنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں، جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں مگر صرف چھ آدمی اُس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اُس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نے یہی کہا۔ "بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے۔" نہ جانے کیا بات تھی کہ اُن میں سے ہر ایک نے اُسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اُس نے خود اُس سے کہا۔ "دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اِس سے ایک ادھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔" چھٹے آدمی نے یہ بات سُن کر تکرار نہ کی اور اُس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کرکے وہ اپنا کوٹ اُتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ "لائیے ایک روپیہ دودھ کا۔" اُس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنّی جیب میں سے نکال کر اُسکو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں — بیس روپے ماہوار تو اُس کوٹھے کا کرایہ تھا جسکو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔

اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایکدم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اُسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے اس پاخانہ میں گئی تو اُس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اُٹھنے لگی تو اُس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اِس زنجیر کو دیکھ کر اُس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں، یہ زنجیر اس لئے لگائی گئی ہے کہ اُٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مِل جایا کرے مگر جونہی اُس نے زنجیر پکڑ کر اُٹھنا چاہا، اُوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائی ڈرو کوئین ڈال رہا تھا کہ اُس نے سلطانہ کی چیخ سُنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ —— یہ چیخ تمہاری تھی؟"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "یہ مُوا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اُس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اُس نے لاری چلانا سیکھا چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اُس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس لئے اُس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالے میں ہے۔ وہ اُس کی تلاش میں انبالے آیا جہاں اُس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اُس کو پسند کیا، چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اُٹھا۔ عورت چوں کہ ضعیف الاعتقاد تھی اِس لئے اُس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی، چنانچہ اِس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اُس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اِس سے اُس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اُس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا، چنانچہ اُس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اُس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی، چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں

لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مُستقل گاہک بن گئے اور اُس کی آمدنی پہلے سے دوگنی ہوگئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بُندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوالیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کرلیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اُس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ اِنکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اُس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کرلیا بلکہ اُس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اُس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سُن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اُسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہونچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کردیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈّے نہ بنائیں۔ نیچے دوکانیں تھیں اور اُوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اِس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقّت محسوس ہوئی تھی پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اُس کو ایک پکّی نشانی مِل گئی۔ ”یہاں میلے کپڑوں کی دُھلائی کی جاتی ہے“ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کرلیا کرتی تھی۔ اِسی طرح اُس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کرلی تھیں۔

مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دوکان" لکھا تھا وہاں اُس کی سہیلی ہیر آبائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اُس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نوا‌ٹر کے کارخانہ کے اُوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اِس لئے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دوکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں، چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اُس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلّی دی، پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اُس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اُسے بہت تشویش ہوئی۔ اُس نے خدا بخش سے کہا: "کیا بات ہے خدا بخش، دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے اِدھر کا رُخ ہی نہیں کیا —— مانتی ہوں آجکل بازار بہت مندا ہے پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔"

خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اُس نے کہا۔ "میں کئی دنوں سے اِس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ، دوسرے دھندوں میں پڑ کر اِدھر کا رستہ بھول گئے ہیں —— یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ....."

وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اِس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں آئیں تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہوگئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا۔ "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے میں۔ یہاں کیا دھرا ہے؟ ــــــ بھئی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اسکو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی یہاں سے چلدیں گے۔"

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔ "نہیں جانِ من، انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی، چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا، پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اسکو بہت برا لگتا

تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اُس نے اِن سہیلیوں سے مِلنا جلنا بالکل ترک کردیا۔ سارا دن وہ اپنے سُنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پُرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکونی میں آکر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اُس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں۔ اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح اُبھری رہتی تھیں۔ اِس لمبے اور کُھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں، کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ اِن انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اُٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں اُسے نظر آتا۔ دُھندلکے میں انجنوں کے مُنہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اُٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مِل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبّے کو جسے انجن نے دھکّا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اُسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اُسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکّا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔

—— نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اُس دھکّے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رُک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اُس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی اِن ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھیرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اُس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اُس کا مکان تھا مگر وہاں اُس نے کبھی اِن چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اُس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اُٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جنکو چند موٹے موٹے انجن اِدھر اُدھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اُس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گُذرتا دیکھتی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اُوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب اِس قسم کے خیال اُس کو آنے لگے تو اُس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اُس نے بارہا کہا۔ ”دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔“ مگر اُس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اُسکی تشفّی کر دی۔ ”جانِ من —— میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔“

پُورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرّم کا مہینہ سر پر آرہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اِس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اُس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اُس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اِس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا بیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اُس کو اِس احساس نے بہت دُکھ دیا کہ وہ محرّم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اُس کا دل بہت مغموم تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا سا اُس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی، پر جب اُس کی گردن اُونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اُٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا اِس لئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چُپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اُونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مُسکرا دی اور اُس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا

تھا۔ سلطانہ نے غور سے اِسکی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اُس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اُس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اُسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اُس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اُسے اشارہ کیا۔ اُس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پُوچھا، کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اُسے راستہ بتادیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پُھرتی سے اُوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اُسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اُس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا۔ "آپ اُوپر آتے ڈر رہے تھے۔" وہ آدمی یہ سُن کر مُسکرایا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا ——— ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اِس پر سلطانہ نے کہا۔ "یہ میں نے اِس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر اِدھر آئے۔" وہ یہ سُن کر پھر مُسکرایا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اُوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لئے ٹھیر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پُوچھا۔ "آپ جارہے ہیں؟" اُس آدمی نے جواب دیا۔ "نہیں، میں تمہارے اِس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ——— چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سلطانہ نے اُسکو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھادئے۔ اُس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اُسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اُس آدمی نے کہا۔ "میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اُس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی اُن میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اُس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اِس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا چنانچہ اُس نے شنکر سے کہا۔ "فرمائیے......"

شنکر بیٹھا تھا، یہ سُن کر لیٹ گیا۔ "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے۔" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ "میں سمجھا، لو اب مجھ سے سُنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دیکر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔"

سلطانہ یہ سُن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اُسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں...... میں...... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنا کر کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی — آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور

کرتے ہوں گے۔"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی۔"

"جھک مارتی ہوں۔"

"میں بھی جھک مارتا ہوں۔"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"

"میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو ــــ یہ لنگر خانہ نہیں۔"

"اور میں بھی والنیٹر نہیں ہوں۔"

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ والنیٹر کون ہوتے ہیں۔"

شنکر نے جواب دیا۔ "اُلو کے پٹھے۔"

"میں بھی اُلو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی خدابخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور اُلو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدارسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جارہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا۔ "تم ہندو ہو، اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اُڑاتے ہو۔"

شنکر مسکرایا۔ "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ پنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں۔"

"جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ــــ بولو رہو گے؟"

"اُسی شرط پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "تو جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اُٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا۔ "میں کبھی کبھی اس بازار سے گذرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بُلا لینا ـــــ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اُس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اُس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اُسے دھکے دیکر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت اُداس رہتی تھی اس لئے شنکر کی باتیں اُسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اُس سے پوچھا۔ "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا، کہنے لگا۔ "پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھیرے ہوئے ہیں، اُنہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں ـــــ"

"کچھ اُنھوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے ـــــ پر سلطانہ، میں جو اُنکی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرّم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا، خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی۔ "سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو ـــــ میں یہاں پنجرے میں

بند رہتی ہوں، نہ کہیں جا سکتی ہوں نہ آسکتی ہوں۔ محرم سر پر آگیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں، اب تم ہی بتاؤ کیا ہوگا؟ ــــ ان فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا "پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیئے ــــ خدا کے لئے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لئے کرتا ہے، کیا پتا ہے کہ کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم ......"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لئے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ مارو، پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی ایک قمیص پڑی ہے، اس کو میں کالا رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا، یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی کالا رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے، سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو .... دیکھو تمہیں میری جان کی قسم، کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو ــــ میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا "اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو ــــ میں کہاں سے لاؤں گا ــــ افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔"

"دُعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے ــــ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اُٹھا۔ "لو اب اِن باتوں کو بھول جاؤ، میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی خدا بخش پُرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ اِدھر اُدھر کمروں میں ٹہلتی رہی، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اُس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اُس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اُس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی، جب اُٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں موری کے پاس پہونچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اُسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہونچ کر اُس نے گردن اُونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اُسے اُوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اُس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اُسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اُس کا اپنا گھر ہے، چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اُس سے کوئی بات نہ کی تو اُس نے کہا۔ "تم مجھے سو دفعہ بُلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ —— میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی، کہنے لگی۔ "نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ —— نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں —— چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو —— کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دُنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔ "صاف صاف کہو، تُم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"جو دوسرے چاہتے ہیں!" شنکر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا!"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ اُن میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق

ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پُوچھنا نہیں چاہئیں، خود سمجھنا چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اِس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا۔ "مَیں سمجھ گئی ہوں۔"

"تو کہو، کیا ارادہ ہے؟"

"تم جیتے، میں ہاری۔" پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تم غلط کہتی ہو ــــــ اسی محلّے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مِل جائینگی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلّت قبول کرسکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن اُن کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو ــــــ تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے۔"

شنکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔ "میرا نام شنکر ہے ــــــ یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں، چلو آؤ اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ "شنکر میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا۔ "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر۔۔"

"کہو کہو ــــ رُک کیوں گئی ہو۔"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ محرّم آرہا ہے اور میرے

پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں ـــــ یہاں کے سارے دُکھڑے تو تم مجھ سے سُن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سُن کر کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دیدوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو؟"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا۔ "نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو۔"

شنکر مسکرایا۔ "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرّم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں۔" سلطانہ کے بُندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا۔ "کیا یہ بُندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اِس پر شنکر نے کہا۔ "میں نے تم سے بُندے مانگے ہیں۔ اِن کی قیمت نہیں پُوچھی۔ بولو، دیتی ہو؟"

"لے لو۔" یہ کہہ کر سلطانہ نے بُندے اُتار کر شنکر کو دیدئے۔ اُس کو بعد میں افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرّم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اُس نے سلطانہ کو دی اور کہا۔

"ساٹن کی کالی شلوار ہے ــــــ دیکھ لینا۔ شاید لمبی ہو ــــــ اب میں چلتا ہوں۔"
شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اُس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اُس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہے اور سیدھا اِدھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بُندوں اور اُس سودے کا جو افسوس اُسے ہوا تھا اِس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دُور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے کر آئی۔ تینوں کالے کپڑے اُس نے جب پہن لئے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی۔ اُس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے ــــــ کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا۔ "آج ہی درزی لایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں۔ "یہ بُندے تم نے کہاں سے لئے؟"

انوری نے جواب دیا۔ "آج ہی منگوائے ہیں۔"

اِس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

سعادت حسن منٹو

منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دُور نہیں جاسکتے اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

"منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ چھُوا ہے، چکھا ہے اوراب وہ ایک نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ مریض چیختا ہے، چلّاتا ہے، بین کرتا ہے، منٹو کو اس کی پروّاہ نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

"منٹو آدم کی جرأتِ گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نُوری ہے نہ ناری، وہ آدمِ خاکی ہے —— وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل وخون وغیرہ کے باوجود، خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

ممتاز شیریں

مکتبۂ شعر وادب، سمن آباد، لاہور ۲۵